اِک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبّت کا اُڑایا ہے مذاق

# کُلیّاتِ ساحر

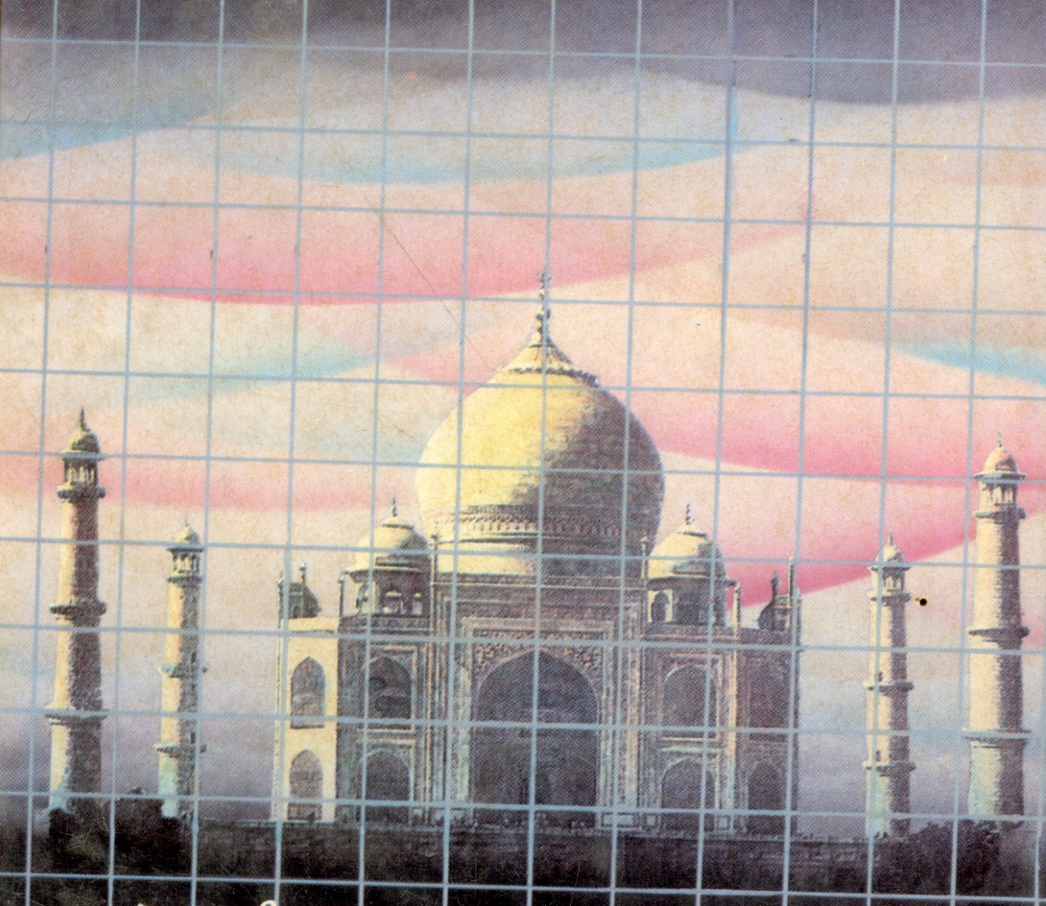

ساحرؔ لدھیانوی

# کُلیاتِ ساحر

ساحر لُدھیانوی

الحمد پبلی کیشنز

رانا چیمبرز۔ سیکنڈ فلور۔ (چوک پرانی انار کلی)۔ لیک روڈ۔ لاہور

ھماری کتابیں .....

خُوبصورت، معیاری اور

کم قیمت کتابیں

تزئین و اہتمام اشاعت

صفدر حسین

ضابطہ :


بار اوّل : ۱۹۹۵ء

مطبع : شرکت پرنٹنگ پریس لاہور

سرورق : ایس ایم فاروق

کتابت : محمد اشرف انجم

قیمت : ۲۰۰/- روپے

۵

# اک دیا اور بجھا

کرشن کی بھیڑیں، رام کی بھیڑیں -- بُدھ مَت اَور اسلام کی بھیڑیں
ان کو اللہ والی کہہ کر -- وَحدت کی مَتوالی کہہ کر
جب جی چاہے مت پلٹا دو -- مت پلٹا دو، بھینٹ چڑھا دو

ساحِر سے میری جان پہچان اُس کی اِس سپاٹ سی نظم کے ذریعے ہوئی تھی۔ یہ ۴۳-۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ میں اور سیف (سیف الدین سیف) ایف اے کے امتحان کی تیاری کرنے کے لئے امرتسر سے لاہور آئے ہوئے تھے۔ امرتسر میں دن رات چائے خانوں میں اَدبی بحث مباحثوں میں مصروف رہتے اور تعلیم پر پوری توجہ نہ دیتے۔ ایک دِن سیف نے کہا کہ راہی یہاں پڑھا نہیں جاتا، فیل ہو جائیں گے۔ لاہور چلتے ہیں۔ بھائی محمد علی (سیف کے تایا زاد بڑے بھائی) کے ہاں رہیں گے اور دن رات ڈٹ کر امتحان کی تیاری کریں گے۔ سو ہم لاہور چلے آئے۔ اور لاہور آ کر جس خشوُع و خضوُع سے امتحان کی تیاری کی، اس کی داستان بھی سن لیجئے۔ بھائی محمد علی کی بیوی اپنے میکے امرتسر گئی ہوئی تھی۔ سو کھانا کھانے کے لئے ہمیں منزل ہوٹل میں جانا پڑتا۔ بھائی محمد علی کا گھر موچی دروازہ کے اندر داخل ہوتے ہی تھا اور منزل ہوٹل موچی دروازہ کے سامنے، سرکلر روڈ پر، گوالمنڈی کی طرف جانے والی سڑک کے سرے پر واقع تھا۔ اس ہوٹل کا مالک ظفر زبیری بڑا خوبرو اور وجیہہ نوجوان تھا مگر اس کی ایک ٹانگ فٹ بال کھیلتے ہوئے ضائع ہو گئی تھی اور اب بیساکھی کے سہارے چلتا تھا (جو بعد میں تپ دق جیسے مُہلک مرض کی نذر ہو گیا) خود بھی ایک اچھا

شاعر تھا اور اس کا کلام میرا جی جیسے مُستند شاعر اور نقّاد کی ادارت کے زمانے میں ادبی دنیا میں چھپ چکا تھا۔ اس کی ادب دوستی نے منزل ہوٹل کو بھی عرب ہوٹل، نگینہ بیکری اور اِنڈیا کافی ہاؤس کی طرح شاعروں اور ادیبوں کا اڈہ بنا دیا تھا۔ یہیں پر میں نے باری علیگ، عبدالمجید بھٹی، انجم رومانی، قیوم نظر اور ساحر لدھیانوی کو دیکھا۔ سیف کے ساتھ وہ کافی گھُل مِل کر باتیں کرتے اور میں خاموشی سے سُنتا رہتا۔ سیف اس وقت اچھا خاصا نام پیدا کر چکا تھا۔ لاہور ریڈیو کے مشاعروں میں بھی حصہ لیتا تھا۔ میرے نام کے ساتھ راہی کی دُم تو لگ چُکی تھی۔ مگر وہ صرف دُم ہی تھی۔ یہیں ساحِر نے ایک دِن میٹنگ میں اپنی اوُپر والی نظم "بھیڑیں" سنائی۔ نظم تو یونہی سی تھی۔ تلخیاں کے پہلے ایڈیشن پریت نگر والے میں چھپ چکی ہے۔ نظم نے تو مجھ پر کوئی اثر نہ کیا۔ مگر کچھ دنوں کے میل جول نے ساحر کی شخصیّت کا سحر مجھ پر پھُونک دیا۔

اس کے بعد ۱۹۴۴ء کی سردیوں میں ساحِر سے مُلاقات ہوئی۔ البتہ اِس مُلاقات سے پہلے مجھے ایک دِن کے لئے اپنی خالہ کے ہاں لدھیانہ جانے کا اتفاق ہوا۔ ویک فِیلڈ گنج اس کے گھر جا کر اس کا پتہ کیا۔ بی بی جی (ساحر کی والدہ) نے کہا کہ وہ چودھری فیض الحسن کی طرف گیا ہے۔ میرے ساتھ میرا خالہ زاد تھا۔ چودھری ان کا محلّہ دار تھا۔ وہ مجھے چودھری کے ہاں لے گیا۔ چودھری سے پتہ چلا کہ مرتضیٰ کی طرف گیا ہے۔ مرتضیٰ نے کہا کہ نکودر سے حمید اختر آیا تھا۔ ابن انشا اور حمید اختر اُسے لے گئے ہیں۔ لدھیانہ کی کئی سڑکیں ہیں۔ کسی نہ کسی سڑک پر ان کے ساتھ مِل جائے گا۔ رات ہو گئی تھی۔ اسے مِلے بغیر ہی اگلی صبح میں امرتسر جانے والی فرنٹیر میل میں سوار ہو گیا۔

کچھ مہینوں بعد امرتسر ایم اے او کالج میں مُشاعرہ تھا۔ ظہیر کاشمیری نے عبدالمجید بھٹی، قیوم نظر، یوسف ظفر اور مجید لاہوری کے علاوہ ساحِر کو بھی دعوت دی تھی۔ سیف امرتسر میں نہیں تھا۔ ساحِر میرے پاس آ گیا۔ میرے اور ظہیر کاشمیری کے علاوہ وہاں اسے کوئی نہیں جانتا تھا۔ سارا دن وہ میرے ساتھ رہا اور اس نے اپنی نئی نظم تاج محل مجھے سنائی۔ میں نے مشورہ دیا کہ مشاعرے میں یہ نظم پڑھو۔ وہ ڈانوا ڈول تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ امرتسر والوں کا ادبی ذِوق بڑے پائے کا ہے۔ سیاسی اور ادبی لحاظ سے بڑے باشعوُر ہیں۔ ایم اے او کالج نے ہی فیض صاحب کو شہرت دِلوائی ہے۔ اور پھر ایم اے او کالج ہی سے اِس مشاعرہ میں ساحر کی

شہرت کا آغاز ہُوا۔ تاج محل پڑھنے کے بعد تو اُس نے مشاعرہ جیب میں ڈال لیا۔ ہر طالب علم اُس کا گرویدہ تھا۔ دو تین دِن کالج کے لڑکے اُسے دعوتیں دیتے رہے اور اس کی شاعری کو سراہتے رہے۔۔۔ اِس کے بعد ساحِر کِسی فلِم کے گیت لکھنے کے لِئے بمبئ چلا گیا اور میں دہلی میں مختلف ملازمتیں کرتا اور چھوڑتا رہا۔ ہماری مُلاقات ہُوئی نہ کبھی ایک دوسرے کو خط لِکھا۔ پھر ساحِر سے مُلاقات ستمبر ۱۹۴۷ء میں' قیامِ پاکستان کے بعد کمیونسٹ ہیڈ کوارٹر لاہور میں ہوئی اور جون ۱۹۴۸ء کو اِس کا اَنت ہو گیا۔ ساحِر کی مَوت تو اَب ۱۹۸۰ء میں ہُوئی ہے۔ ہم سے بِچھڑ تو وہ ۳۲ سال پہلے گیا تھا۔

ستمبر ۱۹۴۷ء سے جون ۱۹۴۸ء تک ہم دونوں چوبیس گھنٹے اکٹھے رہے ہیں۔ سوتے بھی ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ سونے سے پہلے ہر رات وہ میرے ساتھ جھگڑتا کہ مَیں اَپنے لئے چارپائی خرِیدوں۔ میں چارپائی کے لئے پیسے کہاں سے لاتا۔ اُس کا لہجہ جب زیادہ ہی تیز ہو جاتا تو مَیں آخری حربہ اِستعمال کرتا کہ مَیں اَپنے گھر جا کر سوتا ہوں اور پاس ہی دُوسری چارپائی پر لیٹا ہوا شیر محمد عرف قیصر المتخلص ابنِ اِنشا قہقہہ لگا دیتا' جس پر ساحر ہتھیار ڈال دیتا۔

اَیبٹ روڈ پر ساحِر کی شکستہ سی کوٹھی کے ساتھ ہی ابنِ اِنشاء کا چھوٹا سا پگوڈا نما مکان تھا۔ ہم اِس کے باہر ایک کھلی جگہ پر چارپائیوں پر کروٹیں بدلتے رہتے۔ کیونکہ دیوار کے ساتھ ہی کیپٹل سینما تھا۔ اس میں چلنے والی فلِم کے مُکالموں اور گانوں کی وجہ سے' آخری شو کے ختم ہونے سے پہلے نیند آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس فلم کے ڈائیلاگ اور گیت ساحرکوحفظ ہو گئے ہوں گے۔ کیونکہ اُس کا حافظہ بَلا کا تھا۔ آغا حشر اور ماسٹر رحمت کے کئی ڈراموں کے مکالمے اور اشعار اُسے ازبر تھے جو وہ اکثر لہک لہک کر اسٹیج کے اداکاروں کی نقل اتارتے ہوئے سُنایا کرتا اور بچوں کی طرح خُوش ہوتا۔

چارپائی کے جھگڑے کے علاوہ' اس کا اور میرا ایک اور روزانہ کا جھگڑا تھا۔ وہ سردیوں کے دِنوں کا تھا۔ ہمیں جو مکان الاٹ ہوا تھا۔ اُس میں سے ایک اوور کوٹ ملا تھا۔ امرتسر سے ہم لُٹ پِٹ کر آئے تھے۔ نہ پیسے تھے نہ گرم کپڑے۔ میرے چھوٹے بھائی نے ایک سویٹر مجھے دے دیا تھا' جو میں سارا دن پہنے رہتا۔ صبح اور شام کے وقت اوور کوٹ پہن لیتا۔ ان دنوں سردی بھی ہڈیاں چٹخا دینے والی پڑتی تھی۔ اب تو ویسی سردی کا پَرتو بھی دکھائی نہیں دیتا۔ ایک شام میں باہر سے کانپتا ہوا آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اوور کوٹ ساحر نے پہن رکھا

ہے۔ غصّہ تو مجھے بہت آیا مگر میں خاموش رہا۔ رات نشاط سینما میں آخری شو دیکھنے کے بعد، سامنے گھر کی طرف جانے کی بجائے، اُس نے شِملہ پہاڑی کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ اوور کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اور میں دل ہی دل اُس کو بُرا بھلا کہتا ہوا ٹھٹھرتا ہوا اس کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ شِملہ پہاڑی سے بھی بہت آگے ایچی سن کالج کے ساتھ والی سڑک پر ہو لیا۔ تھوڑی دور آگے چل کر وہ میو گارڈن کے گائیڈ بورڈ کے سامنے رُک کر اور پھر کچھ دیر بعد بڑی معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھ کر، بورڈ پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے مسکرا کر بولا "یُو آر ہیئر---" اب ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ اُن دنوں وہاں وہ اُلٹرا ماڈرن افسانہ نویس رہتی تھی جس کے ساتھ اُس کا نیا نیا ففٹی پر سٹ عِشق شروع ہوا تھا۔ ففٹی پر سٹ سے میری مراد ہے کہ دوسری طرف سے کسی قسم کا بھی کوئی مثبت یا منفی ردعمل نہیں تھا، سوائے ایک محبوب سی ہنسی کے جِس سے ساحِر اپنے دل کو گھائل کر رہا تھا۔ ساحِر کے تقریباً سبھی عِشق ففٹی پر سٹ رہے ہیں۔ وہ ہر عِشق میں "گائیڈ بورڈ" سے آگے نہیں بڑھا۔ البتہ ایک لڑکی خُود گائیڈ بورڈ کراس کر کے اپنے گاؤں سے اس کے گھر میں آ گئی۔ مگر یہاں وہ خود ایک بورڈ کی طرح بے جان ہو گیا۔۔ اب میو گارڈن جانا اس کا ہر رات کا معمول تھا۔ مَیں نے اسے کہا کہ ساحِر یہ کھیل لاحاصِل ہے۔ وہ شادی شُدہ ہے۔ اُس کا شوہر ریلوے کا افسر ہے۔ تمہیں وہ گھاس نہیں ڈالے گی۔ صرف سویرا میں چھپ کر شہرت حاصل کرنا چاہتی ہے۔ (ساحر اُن دنوں سویرا کا ایڈیٹر تھا) مگر ساحِر نے میری بات کو لِفٹ نہیں دی۔ بعد میں، میں نے سوچا کہ یہ تو لاحاصل کھیل کھیلنے کا عادی ہے۔ امرتا بھی تو شادی شدہ ہے اور کھاتے پیتے خوش حال شخص کی بیوی ہے۔ ایک رات کڑاکے کی سردی تھی۔ کوئٹہ کی برفانی ہواؤں نے لاہور کو اپنی زد میں لیا ہُوا تھا۔ میں پالے سے ٹھرو ٹھرو کر رہا تھا اور وہ اوور کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، اوور کوٹ کا کالر چڑھا کر کسی فلمی ہیرو کی طرح ہیروئن کے بنگلے کی طرف جا رہا تھا۔ واپسی پر مَیں نے اسے گڑھی شاہو کے قبرستان میں ایک ٹوٹی ہوئی قبر کے اُوپر پچھاڑ لیا "اگر تم نے عشق کرنا ہے تو اوور کوٹ مجھے دیدو۔ تمہارے اندر تو عشق کی گرمی ہے۔ میں اس سردی میں نمونیہ سے نہیں مَرنا چاہتا۔ اوُور کوٹ دیدو، ورنہ میں تمہیں اِس قبر کے اندر لٹا دوں گا" اُس نے اوُور کوٹ واپس کرنے کا وَعدہ تو کر لیا مگر واپس نہیں کیا۔ بلکہ اِنڈیا جاتے وقت، جوُن کی چلچلاتی ہوئی گرمی میں اُس نے وہ اوور کوٹ پہنا ہوا

تھا۔ سر پر فلیٹ ہیٹ، آنکھوں پر گوگلز چڑھا رکھے تھے۔ اپنی دانست میں وہ اس طرح سی آئی ڈی والوں سے چھپ کر یہاں سے جا رہا تھا۔

سی آئی ڈی کا خوف ساحر پر آغا شورش کاشمیری نے طاری کر رکھا تھا۔ شورش ساحر کا دلی ہمدرد اور خیرخواہ تھا۔ وہ تو ہمدردی کے طور پر ساحر کو آنے والی تکالیف سے خبردار کرتا مگر ساحر اندر سے ہل چکا تھا۔ اپنی نظموں میں وہ جتنا جیالا دکھائی دیتا ہے۔ اپنی عملی زندگی میں وہ اتنا ہی ڈرپوک تھا۔ اُسے ہر وقت محافظ کی ضرورت رہتی تھی۔ شروع سے ہی وہ محافظوں کا محتاج رہا۔ لدھیانہ میں چودھری فیض الحسن، انور (آگ کی آغوش میں) مُرتضیٰ، ابنِ انشاء، حمید اختر وغیرہ۔ جب امرتسر ایم اے او کالج میں مشاعرہ پڑھنے کے لئے آیا تو اِس کا ایک ہندو دوست جے دیو اُس کے ساتھ تھا، جس کو اس نے میوزک ڈائریکٹر بنوایا تھا۔ بمبئی جاتے وقت وہ حمید اختر کو ساتھ لے کر گیا تھا اور اُسے بھی اپنی فلم کمپنی میں ملازمت دلوائی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد لاہور آیا تو چودھری نذیر اور میں اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ اِنڈیا واپس جانے پر، پرکاش پنڈت اُس کا محافظ بنا رہا۔ ہو سکتا ہے ساحر کے شورش سے تعلقات اِسی بُزدلی کے باعث ہوں کیونکہ شورش بڑا دبنگ اور دلیر تھا۔ ساحر کے لئے وہ ڈھال تھا۔ مگر شورش کو ساحر سے واقعی پیار تھا۔ ساحر سے نظریاتی اختلاف کے باوجود۔ ساحر کے مالی حالات اچھے نہیں تھے۔ ویسے تو وہ سویرا کا ایڈیٹر تھا، مگر دس دس بیس بیس روپوں کی قسطوں میں چودھری نذیر سے جو تنخواہ ملتی تھی، وہ گھر تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی تھی اور گھر کا خرچ بی بی جی اپنے زیور بیچ کر چلاتی تھیں۔ ایک تو حالات پریشان کُن تھے، دوسری شورش کی باتیں۔ شورش، ساحر سے ہمدردی جتاتے ہوئے ترقی پسندوں اور کمیونسٹوں کے خوب لتّے لیتا۔ وہ ساحر سے اکثر کہا کرتا کہ یہ لوگ تمہارے کندھے پر بندوق رکھ کر تمہیں قربانی کا بکرا بنا رہے ہیں۔ اُدھر ساحر کو کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے اُمید دلائی گئی تھی کہ ''امروز'' جاری ہوتے ہی اُسے ایڈیٹوریل اسٹاف میں رکھ لیا جائے گا۔ ''امروز'' کے اِجرا پر یہ اُمید بھی ٹوٹ گئی۔ مولانا چراغ حسن حسرت ایڈیٹر تھے۔ ان کی ایک مشہور غزل تھی ''آؤ حسنِ یار کی باتیں کریں'' بعد میں تلخیاں میں چھپی تھی۔ مولانا حسرت نے بڑا بُرا محسُوس کیا تھا۔ ساحر کا اِمروز کے ایڈیٹر اسٹاف میں داخلہ کیسے ہوتا۔ ساحر کی اِس سِلسلہ میں مِیاں افتخارُ الدین سے بھی ایک دو مُلاقاتیں ہوئیں تھیں۔ مگر بے سُود۔ اِس ترقی پسند اخبار نے رجعت پسند ادیبوں کے لئے

دروازے تو کھول رکھے تھے مگر ترقّی پسند ساحرؔ کو اندر نہیں گھُسنے دیا۔ ساحرؔ اِس رویّہ سے مایُوس ہو گیا اور شورِش کی باتوں میں اُسے صداقت نظر آنے لگی۔ یُوں بھارت کی وہ دَولت جو مُلک کی تقسیم میں پاکستان کے ہاتھ لگی تھی، جُون ۱۹۴۸ء میں پھر بھارت کی تجوری میں چلی گئی۔

ساحرؔ کی شاعری کو دوست تو کیا اس کے وہ دُشمن بھی قابلِ تحسین و ستائش گردانتے ہیں جنھوں نے اسے کو اُس کی موت کے بعد بھی تختۂ ستم پر کھڑا کر رکھا ہے۔ حالانکہ یہی لوگ دُوسروں کو نصیحت کرتے رہتے ہیں کہ مَرے ہوؤں کو کچھ نہیں کہنا چاہئے۔ مُنافق لوگ۔

ساحرؔ کی شاعری میں بے حد تلخی ہے۔ یہ تلخی اُس سنگدِل سماج، اُس اِستحصالی مُعاشرہ کے خلاف ہے، جِس نے اُس کو باپ کی زندگی میں بھی یتیم بنائے رکھا۔ اس کو اپنے باپ کی زمینوں سے تو حِصّہ ملا، وہ بھی مقدمہ بازی کے ذریعے، مگر اسے باپ کی شفقت نصیب نہ ہوئی۔ ایک تو ساحرؔ بے حد جذباتی تھا، دُوسرے اُس کے لہُو کی ایک ایک بُوند میں رُچی ہوئی تلخی نے اُردو شاعری کو ایک ایسا شاعِر دیا جِس کی مِثال نہ اُس سے پہلے نہ اُس کے بعد اب تک کہیں مِلتی ہے۔ فِلمی شاعِر کے طور پر بھی وہ اپنے ہر گیت میں اپنے آدرش کا برملا پرچار کرتا رہا۔

ساحرؔ مَر گیا ہے۔ اُس کی موت اُس دل کے ڈُوبنے سے ہوئی جو آج سے چالیس سال پہلے گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں پہلی بار ڈُوبا تھا اور اُس کی موت تک مسلسل ڈُوبتا چلا گیا۔ چالیس سال وہ اِس پیہم ڈُوبتے ہوئے دِل پر اپنے اور مُلک کے عوام کے غموں کے چرکے سہتا رہا اور زندہ رہا۔ وہ کتنا سخت جان تھا۔

ساحرؔ کی شاعری کے علاوہ، اُس کی جو چیز مجھے بہت اچھی لگتی تھی، وہ اس کی رسیلی آنکھوں سے جھانکتا ہوا دُکھ تھا۔ یُوں تو یہ دُکھ ہر وَقت اُس کی آنکھوں کا کجلا بنا رہتا لیکن جب وہ صُبح کے وقت جاگتا اُس وقت اِس دکھ کا عجیب سا بھیگا بھیگا رُوپ ہوتا۔ سِگریٹ کا ایک لمبا سا کش کھینچ کر جب وہ دُھواں چھوڑتا تو اُس وقت یہ دھوئیں میں دُھندلایا ہوا بھیگا بھیگا دُکھ ساحرؔ کے دُکھی دل کے تمام رَاز ہوا میں بکھیر دیتا۔ وہ سِگریٹ سے سِگریٹ سُلگاتا رہتا اور اُس کی آنکھوں سے جھانکتا ہوا دُکھ کئی پُرانے قِصّے چھیڑ دیتا، جنہیں وہ اکیلا ہی سُنتا۔ اب وہ دُکھ بھی مَر گیا ہو گا جو اکیلے ساحرؔ ہی کا نہیں، میرا بھی تھا، آپ کا بھی تھا۔

ساحر کے بہت چاہنے والے تھے۔ ہر شہر میں، ہر جگہ پر۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتا، لوگ اُس کی جانب کھنچے چلے آتے۔ اُس میں ایک بڑی من موہنی کشش تھی۔ یہ کشش اُس نے کسی منصوبہ کے تحت خود میں پیدا نہیں کی تھی، قدرت کی دین تھی۔ اس نے اپنے اردگرد کوئی ہالہ نہیں بنایا تھا۔ اُس کی شخصیت کا ہالہ ہی اِتنا مقناطیسی تھا کہ لوگ خُود بخود اُس میں جکڑے جاتے تھے۔ پڑھنے والوں نے جتنا پیار ساحر سے کیا ہے، اِتنا پیار میں نے اپنی زندگی میں فیض صاحب کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کے لِئے نہیں دیکھا۔ لڑکے لڑکیاں، مرد عورتیں سبھی اس کی شاعری کے سحر سے مسحور تھے۔ وہ اِتنا خُوبصورت نہیں تھا کہ اسے ٹُوٹ کر پیار کیا جاتا بلکہ وہ اپنی شاعری کا تضاد تھا۔ اگر وہ اپنی شاعری کی طرح خُوبصورت بھی ہوتا تو لوگ لارڈ بائرن کو بھی بھُول جاتے۔

لوگ کہتے ہیں کہ ساحر نے کئی بار محبّت کی ہے۔
مجھے اُن لوگوں سے اتّفاق نہیں۔
ساحر کی زندگی میں ایک محبّت ہے۔ ایک نفرت
محبّت اس نے صرف اپنی ماں سے کی ہے اور نفرت صرف اپنے باپ سے،

اُس باپ سے، جس نے اُس کا نام پیار محبّت کے نیک جذبہ کے تحت نہیں بلکہ اپنے ایک دُشمن پڑوسی، اُس وقت کی یونینسٹ پارٹی کے وزیر تعلیم میاں عبدالحئ کو گالیاں دینے کے لئے عبدالحئ رکھّا تھا۔ اُس کا باپ ہر شام اپنی حویلی کے باہر، اپنے ملنے والوں اور اپنے مزارعوں کے درمیان بیٹھ کر بلند آواز میں عبدالحئ کو گالیاں دیتا۔ میاں عبدالحئ لوگوں سے شکایت کرتا تو ساحر کا باپ جواب میں کہہ دیتا کہ میں تو اپنے نالائق بیٹے کو گالیاں دیتا ہوں۔ ساحر کو باپ سے وراثت میں محبّت کی بجائے گالیاں ملی تھیں۔۔ مگر اَپنے باپ سے ساحر کی نفرت کی وجہ بھی دراصل اُس کی اَپنی ماں سے محبّت تھی۔ اُس ماں سے، جو ساحر کی خاطر زندگی بھر ایک بیوہ سہاگن، یا سہاگن بیوہ بنی رہی۔ باقی جتنے پیار اُس کے نام سے وابستہ ہیں، وہ ان کونوں کھدروں کو پُر کرنے کے بہانے ہیں، جو چالیس سال پہلے خالی ہو گئے تھے۔ کِتنا عظیم تھا وہ۔ چالیس سال تک اپنے ٹُوٹے ہوئے، ڈُوبتے ہوئے دِل کے ساتھ دُکھوں کے گڑھے پُر کرنے میں لگا رہا۔

ساحر نے آغا شورش کے چھوٹے بھائی، آغا یورش کی موت پر، اُس کا مرثیہ اِس شعر

سے شروع کیا تھا۔

اِک دِیا اور بجُھا اَور بڑھی تاریکی
شَب کی سنگین سیاہی سے مُبارک کہہ دو

ساحِر کے اِس شعر پر مَیں اپنا مضمون ختم کرتا ہوں، کہ یہ شعر اُس کا مرثیہ بھی ہے۔

احمد راہی

(ساحر کے تعزیتی اجلاس کے موقع پر، پاک ٹی ہاؤس لاہور میں پڑھا گیا)

تنگ آ چکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم

تلخیاں

# کورے کاغذ کی داستان

۲۵، ۲۶ اکتوبر کی درمیانی رات دو بجے کے قریب ایک فون آیا کہ ساحر نہیں رہے تو پورے بیس دن پہلے کی وہ رات اُس شب میں مل گئی جب مَیں بلغاریہ میں تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا تمہارے دل کی حالت تشویشناک ہے۔ اُس رات میں نے نظم کہی۔

اَج مَیں اپنے دِل دَریا وِچ اپنے پھُل پرواہے

اور اچانک میں اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھنے لگ گئی کہ ان ہاتھوں نے اپنے دل کے دریا میں تو اپنی ہڈیاں بہائی تھیں۔ پھر یہ ہڈیاں کیسے تبدیل ہو گئیں؟ یہ فریب ہاتھوں نے کھایا تھا یا موت نے؟

وقت سامنے آگیا جب دِلّی میں پہلی ایشین رائٹرز کانفرنس ہوئی تھی شاعروں اور ادیبوں کو ان کے ناموں کے ڈیلی گیٹ "بیج" دیئے گئے جو سب نے اپنے کوٹوں پر لگا رکھے تھے۔ ساحر نے اپنے کوٹ پر میرے نام والا "بیج" لگا لیا تھا اور اپنے نام کا "بیج" اپنے کوٹ سے اتار کر میرے کوٹ پر لگا دیا تھا اُس وقت کسی کی نظر پڑی اور اُس نے کہا ہم نے غلط "بیج" لگا رکھے ہیں۔ ساحر ہنس دیا تھا کہ بیج دینے والوں سے غلطی ہوئی ہوگی۔ لیکن اس غلطی کو ہم نے درست کرنا تھا نہ کیا۔ اب برسوں بعد جب رات کے دو بجے خبر سنی کہ ساحر نہیں رہے تو لگا جیسے موت نے اپنا فیصلہ اُس بیج کو پڑھ کر کیا جو میرے نام والا تھا اور ساحر کے کوٹ پر لگا ہوا تھا۔

میری اور ساحر کی دوستی میں کبھی بھی الفاظ حائل نہیں ہوتے۔ یہ دو خاموشیوں کا ایک حسین

رشتہ تھا۔ میں نے اُسکے لیے جو نظمیں کہی تھیں اس مجموعہ کلام کو ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ ملا۔ پریس رپورٹر میری تصویریں لینے لگے۔ میں نے اس وقت محسوس کیا کہ میں کاغذ پر کچھ لکھ رہی ہوں۔
فوٹو گرافر جب تصویریں لے کر چلے گئے تو کاغذ اٹھا کر دیکھا تو اُس پر بار بار صرف ایک لفظ لکھا گیا تھا۔ ساحر ساحر ساحر......

اپنے اس دیوانگی کے عالم پر بعد میں گھبراہٹ ہوئی کہ صبح جب اخبار میں تصویر چھپے گی اور تصویر والے کاغذ پر سے یہ نام بھی پڑھا جائے گا تو کیسی قیامت آئے گی؟ لیکن قیامت نہیں آئی۔ تصویر چھپی تو کاغذ بالکل کورا دکھائی دے رہا تھا۔

یہ الگ بات ہے کہ بعدازاں یہ حسرت رہی کہ خدایا یہ کاغذ جو خالی دکھائی دے رہا تھا یہ خالی کاغذ نہیں تھا۔ شاید یہی کورے کاغذ کا رشتہ تھا کہ آج سے تئیس برس پہلے جب "تلخیاں" کا ایک نیا ایڈیشن شائع ہو رہا تھا تو ساحر نے مجھے اس کا دیباچہ لکھنے کے لیے کہا تھا مگر میرے احساسات میری طرح خاموش رہے۔ نہ جانے کورے کاغذ کی یہ کیسی ضد تھی میں "تلخیاں" کا دیباچہ نہیں لکھ پائی۔

کورے کاغذ کی آبرو آج بھی اُسی طرح ہے۔ میں نے اپنی سوانح عمری "رسیدی ٹکٹ" میں اپنے معاشقے کی داستان لکھی تھی۔ ساحر نے پڑھی تھی۔ لیکن اس کے بعد کسی بھی ملاقات میں رسیدی ٹکٹ کا ذکر نہ میری زبان پر آیا نہ ساحر کی زبان پر۔

آج جب ساحر دنیا میں نہیں اور "تلخیاں" کا ایک نیا ایڈیشن چھپ رہا ہے۔ تو اس کے پبلشر نے چاہا ہے کہ اس کا دیباچہ لکھ دوں۔ نظموں کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گی کیونکہ ساحر کی شاعری کا مقام لوگوں کی روح اور تاریخ کی رگوں کا حصہ بن چکا ہے۔

مجھ پر ساحر کا قرض تھا۔ اُس دن سے جب اُس نے اپنے مجموعہ کلام پر دیباچہ لکھنے کو کہا اور مجھ سے لکھا نہیں گیا۔ آج وہی قرض اتار رہی ہوں۔ اُس کے جانے کے بعد دیر ہو گئی، خدایا بہت دیر ہو گئی!

مجھے یاد ہے ایک مشاعرے میں کچھ لوگ ساحر سے آٹوگراف لے رہے تھے جب لوگ چلے گئے اور میں اکیلی اُس کے پاس کھڑی رہ گئی تو ہنستے ہوئے میں نے اپنی ہتھیلی اُس کے

سامنے بڑھا دی ۔ کورے کاغذ کی طرح اور اس نے میری ہتھیلی پر اپنا نام لکھ دیا اور کہا ۔ "یہ بلینک چیک پر میرے دستخط ہیں جو رقم چاہو لکھ لینا اور جب چاہو کیش کروا لینا ۔" چاہے وہ کاغذ مانس کی ہتھیلی تھی ۔ لیکن اُس نے کورے کاغذ کا نصیب پایا تھا اس لئے کوئی حرف اُس پر نہیں لکھا جا سکتا تھا ۔

حرف تو آج بھی میرے پاس نہیں ۔ یہ تو محض کورے کاغذ کی داستان ہے ۔ اس داستان کی ابتدا بھی خاموش تھی اور ساری عمر اس کی انتہا بھی خاموش رہی ۔ آج سے چالیس برس پہلے جب لاہور میں ساحر مجھ سے ملنے آیا تھا ۔ آکر چپ چاپ سگریٹ پیتا رہتا ۔ راکھ دانی جب سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھر جاتی تھی تو وہ چلا جاتا اور اس کے جانے کے بعد میں اکیلی سگریٹ کے اُن ٹکڑوں کو جلا کر پیتی تھی ۔ میرے اور اس کے سگریٹ کا دھُواں صرف ہواؤں میں ملتا تھا ۔ سانسیں بھی ہواؤں میں ملتی رہیں اور نظموں کے لفظ بھی ہواؤں میں ۔

سوچ رہی ہوں ہوا کوئی بھی فاصلہ طے کر سکتی ہے وہ پہلے بھی شہروں کا فاصلہ طے کرتی تھی اب اس دُنیا اور اُس دنیا کا فاصلہ بھی ضرور طے کریگی ۔

امرتا پریتم

# فہرست


ردِّ عمل — ۱۹
ایک منظر — ۲۰
ایک واقعہ — ۲۱
یکسوئی — ۲۲
غزل — ۲۴
شہکار — ۲۵
نذرِ کالج — ۲۶
غزل — ۲۸
معذوری — ۲۹
خانہ آبادی — ۳۱
سرزمینِ یاس — ۳۲
غزل — ۳۶
شکست — ۳۷
غزل — ۳۹
کسی کو اداس دیکھ کر — ۴۰
غزل — ۴۴
مرے گیت — ۴۵
اشعار — ۴۷
سوچتا ہوں — ۴۸
ناکامی — ۵۰
مجھے سوچنے دے — ۵۲
اشعار — ۵۴
صبحِ نو روز — ۵۶
گریز — ۵۸
کچھ باتیں — ۶۱
چھلکے — ۶۳
طرحِ نو — ۶۶
تاج محل — ۶۸
لمحۂ غنیمت — ۷۰
طلوعِ اشتراکیت — ۷۱

اجنبی محافظ ۷۳
بلاوا ۷۷
شہزادے ۷۹
شعاعِ فردا ۸۱
بنگال ۸۲
فن کار ۸۴
کبھی کبھی ۸۶
فرار ۸۸
کل اور آج ۹۰
ہراس ۹۲
اسی دوراہے پر ۹۴
ایک تصویرِ رنگ ۹۶
ایک شام ۹۹
احساسِ کامراں ۱۰۱
میرے گیت تمہارے ہیں ۱۰۳
میں نہیں تو کیا ۱۰۵
خودکشی سے پہلے ۱۰۷
پھر وہی کنجِ قفس؟ ۱۰۹
اشعار ۱۱۱
نورجہاں کے مزار پر ۱۱۳
جاگیر ۱۱۵
مادام ۱۱۷
مفاہمت ۱۱۹
آج ۱۲۱
غزل ۱۲۵
نیا سفر ہے پرانے چراغ گل کردو ۱۲۷
شکستِ زنداں ۱۲۹
لہو نذر دے رہی ہے حیات ۱۳۱
غزل ۱۳۵
آوازِ آدم ۱۳۷
متاعِ غیر ۱۳۹
بشرطِ استواری ۱۴۲
غزل ۱۴۴
انتظار ۱۴۵
تیری آواز ۱۴۷
غزل ۱۵۱
خوبصورت موڑ ۱۵۲
غزل ۱۵۴
میرے عہد کے حسینو! ۱۵۶
یہ کس کا لہو ہے ۱۵۹
پرچھائیاں ۱۶۲
دیباچہ علی سردار جعفری ۱۶۵

# کلیاتِ ساحر

دُنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں مَیں

ساحر لدھیانوی

# ردِّ عمل

چند کلیاں نشاط کی چُن کر
مدّتوں محوِ یاس رہتا ہوُں
تیرا مِلنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوُں

# ایک منظر

اُفق کے دریچے سے کرنوں نے جھانکا
فضا تن گئی راستے مُسکرائے

سمٹنے لگی نرم کہُرے کی چادر!
جواں شاخساروں نے گھونگھٹ اٹھائے

پرندوں کی آواز سے کھیت چونکے
پُراسرار لَے میں رہٹ گنگنائے

حسیں شبنم آلود پگڈنڈیوں سے
لپٹنے لگے سبز پیڑوں کے سائے

وُہ دُور ایک ٹیلے پہ آنچل سا جھلکا
تصوّر میں لاکھوں دیئے جِھلملائے

# ایک واقعہ

اندھیاری رات کے آنگن میں یہ صبح کے قدموں کی آہٹ
یہ بھیگی بھیگی سرد ہوا یہ ہلکی ہلکی دھندلاہٹ

گاڑی میں ہُوں تنہا محوِ سفر اور نیند نہیں ہے آنکھوں میں
بھُولے بسرے ارمانوں کے خوابوں کی زمیں ہے آنکھوں میں

اگلے دن ہاتھ ہلاتے ہیں پچھلی پیتیں یاد آتی ہیں
گم گشتہ خوشیاں آنکھوں میں آنسو بن کر لہراتی ہیں

سینے کے ویراں گوشوں میں اِک ٹیس سی کروٹ لیتی ہے
ناکام امنگیں روتی ہیں اُمید سہارے دیتی ہے

وہ راہیں ذہن میں گھومتی ہیں جن راہوں سے آج آیا ہُوں
کتنی اُمید سے پہنچا تھا، کتنی مایوسی لایا ہُوں!

# یکسوئی

عہدِ گم گشتہ کی تصویر دکھاتی کیوں ہو؟
ایک آوارۂ منزل کو ستاتی کیوں ہو؟
وہ حسیں عہد جو شرمندہ ایفا نہ ہُوا
اس حسیں عہد کا مفہوم جتاتی کیوں ہو
زندگی شعلۂ بے باک بنا لو اپنی!
خود کو خاکسترِ خاموش بناتی کیوں ہو
میں تصوّف کے مراحل کا نہیں ہُوں قائل
میری تصویر پہ تم پھُول چڑھاتی کیوں ہو؟
کون کہتا ہے کہ آہیں ہیں مصائب کا علاج
جان کو اپنی عبث روگ لگاتی کیوں ہو؟
ایک سرکش سے محبت کی تمنا رکھ کر!
خود کو آئین کے پھندوں میں پھنساتی کیوں ہو؟

میں سمجھتا ہوں تقدس کو تمدن کا فریب!
تم رسومات کو ایمان بناتی کیوں ہو؟
جب تمہیں مجھ سے زیادہ ہے زمانے کا خیال
پھر مری یاد میں یوں اشک بہاتی کیوں ہو؟
تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کر دو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کر لو

○

محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے
زمانے اب تو خوش ہو زہر یہ بھی پی لیا میں نے

ابھی زندہ ہوں لیکن سوچتا رہتا ہوں خلوت میں
کہ اب تک کس تمنّا کے سہارے جی لیا میں نے

انہیں اپنا نہیں سکتا، مگر اتنا بھی کیا کم ہے
کہ کچھ مدّت حسیں خوابوں میں کھو کر جی لیا میں نے

بس اب تو دامنِ دل چھوڑ دو بیکار امیدو!
بہت دکھ سہہ لیے میں نے بہت دن جی لیا میں نے

# شہکار

مصوّر! میں ترا شہکار واپس کرنے آیا ہوں

اب ان رنگین رخساروں میں تھوڑی زردیاں بھر دے
حجاب آلود نظروں میں ذرا بے باکیاں بھر دے

لبوں کی بھیگی بھیگی سلوٹوں کو مضمحل کر دے
نمایاں رنگِ پیشانی پہ عکسِ سوزِ دل کر دے

تبسم آفریں چہرے میں کچھ سنجیدہ پن بھر دے
جواں سینے کی مخروطی اٹھانیں سرنگوں کر دے

گھنے بالوں کو کم کر دے مگر رخشندگی دے دے
نظر سے تمکنت لے کر مذاقِ عاجزی دے دے

مگر ہاں بنچ کے بدلے اِسے صوفے پہ بٹھلا دے
یہاں میری بجائے اک چمکتی کار دکھلا دے

# نذرِ کالج

لُدھیانہ گورنمنٹ کالج ۱۹۴۳ء

اے سرزمینِ پاک کے یارانِ نیک نام
باصد خلوص شاعرِ آوارہ کا سلام

اے وادیٔ جمیل مرے دل کی دھڑکنیں
آداب کہہ رہی ہیں تری بارگاہ میں!

تُو آج بھی ہے میرے لئے جنّتِ خیال
ہیں تجھ میں دفن میری جوانی کے چار سال

کملائے ہیں یہاں پہ مری زندگی کے پُھول
ان راستوں میں دفن ہیں میری خوشی کے پُھول

تیری نوازشوں کو بھُلایا نہ جائے گا
ماضی کا نقش دل سے مٹایا نہ جائے گا

تیری نشاط خیز فضائے جواں کی خیر
گلہائے رنگ و بُو کے حسیں کارواں کی خیر

دورِ خزاں میں بھی تری کلیاں کھِلی رہیں
تاحشر یہ حسین فضائیں بسی رہیں!

ہم ایک خار تھے جو چمن سے نکل گئے
ننگِ وطن تھے حدِ وطن سے نکل گئے

گائے ہیں اس فضا میں وفاؤں کے راگ بھی
نغماتِ آتشیں سے بکھیری ہے آگ بھی!

سرکش بنے ہیں گیت بغاوت کے گائے ہیں
برسوں نئے نظام کے نقشے بنائے ہیں

نغمہ نشاطِ رُوح کا گایا ہے بارہا
گیتوں میں آنسوؤں کو چھپایا ہے بارہا!

معصومیوں کے جُرم میں بدنام بھی ہوئے
تیرے طفیل موردِ الزام بھی ہوئے

اس سرزمیں پہ آج ہم اک بار ہی سہی
دنیا ہمارے نام سے بیزار ہی سہی

لیکن ہم ان فضاؤں کے پالے ہوئے تو ہیں
گر یاں نہیں تو یاں سے نکالے ہوئے تو ہیں

○

دیکھا تو تھا یوُں ہی کسی غفلت شعار نے
دیوانہ کر دیا دلِ بے اختیار نے

اے آرزُو کے دُھندلے خرابو! جواب دو
پھر کس کی یاد آئی تھی مجُھ کو پکار نے

تجُھ کو خبر نہیں، مگر اک سادہ لوح کو
برباد کر دیا ترے دو دن کے پیار نے

مَیں اور تم سے ترکِ محبّت کی آرزُو
دیوانہ کر دیا ہے غمِ روزگار نے

اب اے دلِ تباہ ترا کیا خیال ہے
ہم تو چلے تھے کاکلِ گیتی سنوّار نے

# معذوری

خلوت و جلوت میں تم مجھ سے ملی ہو بارہا
تم نے کیا دیکھا نہیں، میں مسکرا سکتا نہیں

میں کہ مایوسی مری فطرت میں داخل ہو چکی
جبر بھی خود پہ کروں تو گنگنا سکتا نہیں

مجھ میں کیا دیکھا کہ تم اُلفت کا دم بھرنے لگیں
میں تو خود اپنے بھی کوئی کام آ سکتا نہیں

روح افزا ہیں جنونِ عشق کے نغمے مگر
اب میں ان گائے ہوئے گیتوں کو گا سکتا نہیں

میں نے دیکھا ہے شکستِ سازِ اُلفت کا سماں
اب کسی تحریک پر بربط اُٹھا سکتا نہیں

دِل تمھاری شدّتِ احساس سے واقف تو ہے
اپنے احساسات سے دامن چھڑا سکتا نہیں

تم مری ہو کر بھی بیگانہ ہی پاؤ گی مجھے
میں تمھارا ہو کے بھی تم میں سما سکتا نہیں

گائے ہیں میں نے خلوصِ دل سے بھی اُلفت کے گیت
اب ریاکاری سے بھی چاہوں تو گا سکتا نہیں

کس طرح تم کو بناؤں میں شریکِ زندگی
میں تو اپنی زندگی کا بار اٹھا سکتا نہیں

یاس کی تاریکیوں میں ڈوب جانے دو مجھے
اب میں شمعِ آرزو کی لَو بڑھا سکتا نہیں

○

پھر نہ کیجے مری گستاخ نگاہی کا گِلہ
دیکھیے آپ نے پھر پیار سے دیکھا مجھ کو

# خانہ آبادی

## ایک دوست کی شادی پر

ترانے گونج اٹھے ہیں فضا میں شادیانوں کے
ہوا ہے عطر آگیں ذرّہ ذرّہ مسکراتا ہے

مگر دُور ایک افسردہ مکاں میں سرد بستر پر
کوئی دل ہے کہ ہر آہٹ پہ یُوں ہی چونک جاتا ہے

مری آنکھوں میں آنسو آ گئے نادیدہ آنکھوں کے
مرے دل میں کوئی غمگین نغمہ سرسراتا ہے

یہ رسمِ انقطاعِ عہدِ الفت، یہ حیاتِ نو
محبّت رو رہی ہے اور تمدّن مُسکراتا ہے

یہ شادی خانہ آبادی ہو میرے مُحترم بھائی
مبارک کہہ نہیں سکتا مِرا دل کانپ جاتا ہے

# سرزمینِ یاس

جینے سے دل بیزار ہے
ہر سانس اِک آزار ہے
کتنی حزیں ہے زندگی
اندوہ گیں ہے زندگی
وہ بزمِ احبابِ وطن
وہ ہم نوایانِ سُخن
آتے ہیں جس دم یاد اب
کرتے ہیں دل ناشاد اب
گزری ہوئی رنگینیاں
کھوئی ہوئی دلچسپیاں
پہروں رلاتی ہیں مجھے
اکثر ستاتی ہیں مجھے
وہ زمزمے وہ چہچہے
وُہ روح افزا قہقہے

جب دل کو موت آئی نہ تھی
یوں بے حِسی چھائی نہ تھی
کالج کی رنگیں وادیاں
وہ دل نشیں آبادیاں
وہ نازنینانِ وطن
زھرہ جبینانِ وطن
جن میں سے اِک رنگیں قبا
آتش نفس، آتش نوا
کر کے محبّت آشنا
رنگِ عقیدت آشنا
میرے دلِ ناکام کو
خُوں گشتۂ آلام کو
داغِ جدائی دے گئی
ساری خدائی لے گئی
اُن ساعتوں کی یاد میں
اُن راحتوں کی یاد میں

مغموم سا رہتا ہوں میں
غم کی کسک سہتا ہوں میں
سنتا ہوں جب احباب سے
قصّے غمِ ایام کے
بیتاب ہو جاتا ہوں میں
آہوں میں کھو جاتا ہوں میں
پھر وہ عزیز و اقربا
جو توڑ کر عہدِ وفا
احباب سے منہ موڑ کر
دنیا سے رشتہ توڑ کر
حدِ افق سے اس طرف
رنگِ شفق سے اس طرف
اک وادیٔ خاموش کی
اک عالمِ بے ہوش کی
گہرائیوں میں سو گئے
تاریکیوں میں کھو گئے
ان کا تصور ناگہاں

لیتا ہے دل میں چٹکیاں
اور خوں رلاتا ہے مجھے
بے کل بناتا ہے مجھے
وہ گاؤں کی ہمجولیاں
مفلوک دہقاں زادیاں
جو دستِ فرطِ یاس سے
اور یورشِ افلاس سے
عصمت لُٹا کر رہ گئیں
خود کو گنوا کر رہ گئیں
غمگیں جوانی بن گئیں
رُسوا کہانی بن گئیں
اُن سے کبھی گلیوں میں اب
ہوتا ہُوں میں دو چار جب
نظریں جھکا لیتا ہُوں مَیں
خود کو چھپا لیتا ہُوں میں
کتنی حزیں ہے زندگی
اندوہ گیں ہے زندگی

○

خود داریوں کے خون کو ارزاں نہ کر سکے
ہم اپنے جوہروں کو نمایاں نہ کر سکے

ہو کر خرابِ مے ترے غم تو بھلا دیئے
لیکن غمِ حیات کا درماں نہ کر سکے

ٹوٹا طلسمِ عہدِ محبت کچھ اس طرح
پھر آرزو کی شمع فروزاں نہ کر سکے

ہر شے قریب آ کے کشش اپنی کھو گئی
وہ بھی علاجِ شوق گریزاں نہ کر سکے

کس درجہ دل شکن تھے محبت کے حادثے
ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے

مایوسیوں نے چھین لئے دل کے ولولے
وہ بھی نشاطِ رُوح کا ساماں نہ کر سکے

# شکست

اپنے سینے سے لگائے ہوئے اُمید کی لاش
مدّتوں زلیست کو ناشاد کیا ہے مَیں نے
تُو نے تو ایک ہی صدمے سے کیا تھا دوچار
دِل کو ہر طرح سے بَرباد کیا ہے مَیں نے
جب بھی راہوں میں نظر آئے حریری ملبوس
سَرد آہوں میں تجھے یاد کیا ہے مَیں نے
اور اب جب کہ مِری رُوح کی پہنائی میں
ایک سُنسان سی مغمُوم گھٹا چھائی ہے
تُو دمکتے ہوئے عارض کی شعائیں لے کر
گل شُدہ شمعیں جلانے کو چلی آئی ہے
میری محبُوب، یہ ہنگامۂ تجدیدِ وفا
میری افسردہ جوانی کے لئے راس نہیں
میں نے جو پھُول چُنے تھے ترِے قدموں کیلئے
اُن کا دُھندلا سا تصوّر بھی مرے پاس نہیں

ایک یخ بستہ اُداسی ہے دل و جاں پہ محیط
اب مری روح میں باقی ہے نہ اُمید نہ جوش
رہ گیا دَب کے گراں بار سلاسل کے تلے
میری درماندہ جوانی کی امنگوں کا خروش

ریگ زاروں میں بگولوں کے سوا کچھ بھی نہیں
سایہ ابرِ گریزاں سے مجھے کیا لینا
بجھ چکے ہیں مرے سینے میں محبت کے کنول
اب ترے حسنِ پشیماں سے مجھے کیا لینا

تیرے عارض پہ یہ ڈھلکے ہوئے سیمیں آنسو
میری افسردگیٔ غم کا مداوا تو نہیں
تیری محبوب نگاہوں کا پیامِ تجدید
اک تلافی ہی سہی ــــــ میری تمنا تو نہیں

تنگ آ چکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم

مایوسیٔ مآلِ محبّت نہ پوچھیے
اپنوں سے پیش آئے ہیں بیگانگی سے ہم

لو آج ہم نے توڑ دیا رشتۂ اُمید
لو اب کبھی گلہ نہ کریں گے کسی سے ہم

اُبھریں گے ایک بار ابھی دل کے ولولے
گو دب گئے ہیں بارِ غمِ زندگی سے ہم

گر زندگی میں مِل گئے پھر اتفاق سے
پوچھیں گے اپنا حال تری بے بسی سے ہم

اللہ رے فریبِ مشیت کہ آج تک
دنیا کے ظلم سہتے رہے خامشی سے ہم

# کسی کو اُداس دیکھ کر

تمہیں اُداس سا پاتا ہوں میں کئی دن سے
نہ جانے کون سے صدمے اٹھا رہی ہو تُم
وہ شوخیاں وہ تبسم وہ قہقہے نہ رہے
ہر ایک چیز کو حسرت سے دیکھتی ہو تُم
چُھپا چُھپا کے خموشی میں اپنی بے چینی
خود اپنے راز کی تشہیر بن گئی ہو تُم
میری اُمید اگر مٹ گئی تو مٹنے دو
اُمید کیا ہے بس اِک پیش و پس ہے کچھ بھی نہیں
میری حیات کی غمگینیوں کا غم نہ کرو
غمِ حیات غمِ یک نفس ہے کچھ بھی نہیں
تم اپنے حُسن کی رعنائیوں پہ رحم کرو
وفا فریب ہے، طولِ ہوس ہے کچھ بھی نہیں

مجھے تمہارے تغافل سے کیوں شکایت ہو؟
مری فنا مرے احساس کا تقاضا ہے

میں جانتا ہوں کہ دنیا کا خوف ہے تم کو
مجھے خبر ہے یہ دنیا عجیب دنیا ہے

یہاں حیات کے پردے میں موت پلتی ہے
شکستِ ساز کی آواز رُوحِ نغمہ ہے

مجھے تمہاری جُدائی کا کوئی رنج نہیں
مرے خیال کی دنیا میں میرے پاس ہو تُم

یہ تُم نے ٹھیک کہا ہے تمہیں مِلا نہ کروں
مگر مجھے یہ بتا دو کہ کیوں اُداس ہو تُم

خفا نہ ہونا مری جرأتِ تخاطُب پر؟
تمہیں خبر ہے مری زندگی کی آس ہو تُم

مِرا تو کچھ بھی نہیں ہے میں رو کے جی لُوں گا
مگر خُدا کے لئے تم اسیرِ غم نہ رہو

ہوا ہی کیا جو زمانے نے تم کو چھین لیا
یہاں پہ کون ہوا ہے کسی کا، سوچو تو

مجھے قسم ہے مری دُکھ بھری جوانی کی
میں خوش ہُوں میری محبت کے پھول ٹھکرا دو

میں اپنی رُوح کی ہر اک خوشی مٹا لوں گا
مگر تمہاری مسرت مٹا نہیں سکتا
میں خود کو موت کے ہاتھوں میں سونپ سکتا ہُوں
مگر یہ بارِ مصائب اٹھا نہیں سکتا
تمہارے غم کے سوا اور بھی تو غم ہیں مجھے
نجات جن سے میں اِک لحظہ پا نہیں سکتا
یہ اُونچے اُونچے مکانوں کی ڈیوڑھیوں کے تلے
ہر ایک گام پہ بھُوکے بھکاریوں کی صدا
ہر ایک گھر میں ہے افلاس اور بھوک کا شور
ہر ایک سمت یہ انسانیت کی آہ و بکا
یہ کارخانوں میں لوہے کا شور و غُل جس میں
ہے دفن لاکھوں غریبوں کی رُوح کا نغمہ
یہ شاہراہوں پہ رنگین ساڑھیوں کی جھلک
یہ جھونپڑوں میں غریبوں کے بے کفن لاشے

یہ مال روڈ پہ کاروں کی ریل پیل کا شور
یہ پٹڑیوں پہ غریبوں کے زرد رُو بچے

گلی گلی میں یہ بکتے ہوئے جواں چہرے
حسین آنکھوں میں افسردگی سی چھائی ہوئی
یہ جنگ اور یہ میرے وطن کے شوخ جواں
خریدی جاتی ہیں اٹھتی جوانیاں جن کی
یہ بات بات پہ قانون و ضابطے کی گرفت
یہ ذلتیں، یہ غلامی یہ دورِ مجبوری
یہ غم بہت ہیں مری زندگی مٹانے کو
اُداس رہ کے مرے دل کو اور رنج نہ دو

○

ہوس نصیب نظر کو کہیں قرار نہیں
میں منتظر ہوں مگر تیرا انتظار نہیں

ہمیں سے رنگِ گلستاں ہمیں سے رنگِ بہار
ہمیں کو نظمِ گلستاں پہ اختیار نہیں

ابھی نہ چھیڑ محبّت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

تمہارے عہدِ وفا کو میں عہد کیا سمجھوں
مجھے خود اپنی محبّت پہ اعتبار نہیں

نہ جانے کتنے گلے اس میں مضطرب ہیں ندیم
وہ ایک دل جو کسی کا گلہ گزار نہیں

گریز کا نہیں قائل حیات سے لیکن
جو سچ کہوں کہ مجھے موت ناگوار نہیں

یہ کس مقام پہ پہنچا دیا زمانے نے
کہ اب حیات پہ تیرا بھی اختیار نہیں

# مرے گیت

مرے سرکش ترانے سُن کے دنیا یہ سمجھتی ہے
کہ شاید میرے دل کو عشق کے نغموں سے نفرت ہے
مجھے ہنگامۂ جنگ و جدل میں کیف ملتا ہے
مری فطرت کو خوں ریزی کے افسانے سے رغبت ہے
مری دنیا میں کچھ وقعت نہیں ہے رقص و نغمہ کی
مرا محبوب نغمہ شورِ آہنگِ بغاوت ہے
مگر اے کاش دیکھیں وہ مری پُرسوز راتوں کو
میں جب تاروں پہ نظریں گاڑ کر آنسو بہاتا ہوں
تصوّر بن کے بھولی وارداتیں یاد آتی ہیں
تو سوز و درد کی شدت سے پہروں تلملاتا ہوں
کوئی خوابوں میں خوابیدہ امنگوں کو جگاتی ہے
تو اپنی زندگی کو موت کے پہلو میں پاتا ہوں

میں شاعر ہوں مجھے فطرت کے نظاروں سے الفت ہے
مرا دل دشمنِ نغمہ سرائی ہو نہیں سکتا

مجھے انسانیت کا درد بھی بخشا ہے قدرت نے
مرا مقصد فقط شعلہ نوائی ہو نہیں سکتا

جواں ہوں میں جوانی لغزشوں کا ایک طوفاں ہے
مری باتوں میں رنگِ پارسائی ہو نہیں سکتا

مرے سرکش ترانوں کی حقیقت ہے تو اتنی ہے
کہ جب میں دیکھتا ہوں بھوک کے مارے کسانوں کو

غریبوں مفلسوں کو بے کسوں کو بے سہاروں کو
سسکتی نازنینوں کو تڑپتے نوجوانوں کو

حکومت کے تشدّد کو امارت کے تکبّر کو
کسی کے چیتھڑوں کو اور شہنشاہی خزانوں کو

تو دل تابِ نشاطِ بزمِ عشرت لا نہیں سکتا
میں چاہوں بھی تو خواب آور ترانے گا نہیں سکتا

# اشعار

ہر چند مری قوتِ گفتار ہے محبوس
خاموش مگر طبع خود آرا نہیں ہوتی

معمورۂ احساس میں ہے حشر سا برپا
انسان کی تذلیل گوارا نہیں ہوتی

نالاں ہُوں میں بیداریٔ احساس کے ہاتھوں
دنیا مرے افکار کی دنیا نہیں ہوتی

بیگانہ صفت جادۂ منزل سے گزر جا
ہر چیز سزاوارِ نظارہ نہیں ہوتی

فطرت کی مشیّت بھی بڑی چیز ہے لیکن
فطرت کبھی بے بس کا سہارا نہیں ہوتی

# سوچتا ہوں

سوچتا ہوں کہ محبت سے کنارا کر لوں
دِل کو بیگانۂ ترغیب و تمنا کر لوں

سوچتا ہوں کہ محبت ہے جنونِ رسوا
چند بے کار سے بے ہودہ خیالوں کا ہجوم

ایک آزاد کو پابند بنانے کی ہوس
ایک بیگانے کو اپنانے کی سعیِ موہوم

سوچتا ہوں کہ محبت ہے سرور و مستی
اس کی تنویر سے روشن ہے فضائے ہستی

سوچتا ہوں کہ محبت ہے بشر کی فطرت
اس کا مٹ جانا مٹا دینا بہت مشکل ہے

سوچتا ہوں کہ محبت سے ہے تابندہ حیات
اور یہ شمع بجھا دینا بہت مشکل ہے

سوچتا ہُوں کہ محبت پہ کڑی شرطیں ہیں
اس تمدّن میں مسرت پہ بڑی شرطیں ہیں

سوچتا ہُوں کہ محبت ہے اِک افسردہ سی لاش
چادرِ عزت و ناموس میں کفنائی ہوئی

دورِ سرمایہ کی روندی ہوئی رسوا ہستی
درگہِ مذہب و اخلاق سے ٹھکرائی ہُوئی

سوچتا ہُوں کہ بشر اور محبت کا جنوں
ایسے بوسیدہ تمدن میں ہے اک کارِ زبُوں

سوچتا ہُوں کہ محبت نہ بچے گی زندہ
پیش ازاں وقت کہ سڑ جائے یہ گلتی ہوئی لاش

یہی بہتر ہے کہ بیگانۂ الفت ہو کر
اپنے سینے میں کروں جذبۂ نفرت کی تلاش

سوچتا ہُوں کہ محبت سے کنارا کر لوُں
دل کو بیگانۂ ترغیب و تمنا کر لوُں

# ناکامی

میں نے ہر چند غمِ عشق کو کھونا چاہا
غمِ الفت غمِ دنیا میں سمونا چاہا

وہی افسانے مری سمت رواں ہیں اب تک
وہی شعلے مرے سینے میں نہاں ہیں اب تک

وہی بے سُود خلش ہے مرے سینے میں ہنوز
وہی بیکار تمنائیں جواں ہیں اب تک

وہی گیسو مری راتوں پہ ہیں بکھرے بکھرے
وہی آنکھیں مری جانب نگراں ہیں اب تک

کثرتِ غم بھی مرے غم کا مداوا نہ ہوئی !
میرے بے چین خیالوں کو سکوں مل نہ سکا

دل نے دنیا کے ہر اک درد کو اپنا تو لیا
مضمحل روح کو اندازِ جنوں مل نہ سکا

میری تخئیل کا شیرازۂ برہم ہے وہی
میرے بجھتے ہوئے احساس کا عالم ہے وہی

وہی بے جان ارادے وہی بے رنگ سوال
وہی بے روح کشاکش وہی بے چین خیال

آہ اس کشمکشِ صبح و مسا کا انجام
میں بھی ناکام مِری سعی عمل بھی ناکام

# مجھے سوچنے دے

میری ناکام محبت کی کہانی مت چھیڑ
اپنی مایوس امنگوں کا فسانہ نہ سنا
زندگی تلخ سہی، زہر سہی، سم ہی سہی
درد و آزار سہی، جبر سہی، غم ہی سہی
لیکن اس درد و غم و جبر کی وسعت کو تو دیکھ
ظلم کی چھاؤں میں دم توڑتی خلقت کو تو دیکھ
اپنی مایوس امنگوں کا فسانہ نہ سنا
میری ناکام محبت کی کہانی مت چھیڑ

جلسہ گاہوں میں یہ دہشت زدہ سہمے انبوہ
رہ گزاروں پہ فلاکت زدہ لوگوں کے گروہ
بھوک اور پیاس سے پژمردہ سیہ فام زمیں
تیرہ و تار مکاں، مفلس و بیمار مکیں

نوعِ انساں میں یہ سرمایہ و محنت کا تضاد
امن و تہذیب کے پرچم تلے قوموں کا فساد
ہر طرف آتش و آہن کا یہ سیلابِ عظیم
نت نئے طرز پہ ہوتی ہوئی دنیا تقسیم
لہلہاتے ہوئے کھیتوں پہ جوانی کا سماں
اور دہقان کے چھپر میں نہ بتی نہ دُھواں
یہ فلک بوس ملیں دلکش و سیمیں بازار
یہ غلاظت پہ جھپٹتے ہوئے بھوکے نادار
دُور ساحل پہ وہ شفاف مکانوں کی قطار
سرسراتے ہوئے پردوں میں سمٹتے گلزار
در و دیوار پہ انوار کا سیلابِ رواں
جیسے اک شاعرِ مدہوش کے خوابوں کا جہاں
یہ سبھی کیوں ہے یہ کیا ہے مجھے کچھ سوچنے دے
کون انساں کا خُدا ہے مجھے کچھ سوچنے دے
اپنی مایوس امنگوں کا فسانہ نہ سُنا
میری ناکام محبت کی کہانی مت چھیڑ

# اشعار

عقائد وہم ہیں، مذہب خیالِ خام ہے ساقی
ازل سے ذہنِ انساں بستۂ اوہام ہے ساقی
حقیقت آشنائی اصل میں گم کردہ راہی ہے
عروسِ آگہی پروردۂ ابہام ہے ساقی
مبارک ہو ضعیفی کو خرد کی فلسفہ رانی؛
جوانی بے نیاز عبرت انجام ہے ساقی
ہوس ہوگی اسیرِ حلقۂ نیک و بد عالم
محبت ماورائے فکرِ ننگ و نام ہے ساقی

ابھی تک راستے کے پیچ و خم سے دل دھڑکتا ہے
مرا ذوقِ طلب شاید ابھی تک خام ہے ساقی

وہاں بھیجا گیا ہوں چاک کرنے پردۂ شب کو
جہاں ہر صبح کے دامن پہ عکسِ شام ہے ساقی

مرے ساغر میں مے ہے اور ترے ہاتھوں میں بربط ہے
وطن کی سرزمیں میں بھوک سے کہرام ہے ساقی

زمانہ برسرِ پیکار ہے پُر ہول شعلوں سے
ترے لب پر ابھی تک نغمۂ خیّام ہے ساقی

# صُبحِ نورُوز

پھُوٹ پڑیں مشرق سے کرنیں
حال بنا ماضی کا فسانہ
گونجا مستقبل کا ترانہ
بھیجے ہیں احباب نے تحفے
اَٹے پڑے ہیں میز کے کونے
دُلہن بنی ہوئی ہیں راہیں
جشن مناؤ سالِ نَو کے

نکلی ہے بنگلے کے در سے
اک مفلس دہقان کی بیٹی
افسردہ مرجھائی ہوتی سی
جسم کے دُکھتے جوڑ دباتی
آنچل سے سینے کو چھُپاتی

مُٹھی میں اک نوٹ دبائے
جشن مناؤ سالِ نَو کے

بھُوکے، زرد، گداگر بچے
کار کے پیچھے بھاگ رہے ہیں
وقت سے پہلے جاگ اُٹھے ہیں
پیپ بھری آنکھیں سہلاتے
سر کے پھوڑوں کو کھجلاتے
وہ دیکھو کچھ اور بھی نکلے
جشن مناؤ سالِ نَو کے

# گُریز

مرا جنونِ وفا ہے زوال آمادہ
شکست ہو گیا تیرا فسونِ زیبائی
ان آرزوؤں پہ چھائی ہے گردِ مایوسی
جنہوں نے تیرے تبسّم میں پرورش پائی
فریبِ شوق کے رنگیں طلسم ٹوٹ گئے
حقیقتوں نے حوادث سے پھر جِلا پائی
سکون و خواب کے پردے سرکتے جاتے ہیں
دل و دماغ میں وحشت کی کارفرمائی
وہ تارے جن میں محبت کا نُورِ تاباں تھا
وہ تارے ڈوب گئے لے کے رنگ و رعنائی
سُلا گئی تھیں جنہیں تیری ملتفت نظریں
وہ درد جاگ اُٹھے پھر سے لے کے انگڑائی
عجیب عالمِ افسردگی ہے رو بہ فروغ
نہ اب نظر کو تقاضا نہ دل تمنائی

تری نظر، ترے گیسو، تری جبیں، ترے لب
مری اداس طبیعت ہے سب سے اکتائی
میں زندگی کے حقائق سے بھاگ آیا تھا
کہ مجھ کو خود میں چھپا لے تری فسوں زائی
مگر یہاں بھی تعاقب کیا حقائق نے
یہاں بھی مل نہ سکی جنّتِ شکیبائی
ہر ایک ہاتھ میں لے کر ہزار آئینے
حیات بند دریچوں سے بھی گزر آئی
مرے ہر ایک طرف ایک شور گونج اٹھا
اور اس میں ڈوب گئی عشرتوں کی شہنائی
کہاں تلک کوئی زندہ حقیقتوں سے بچے
کہاں تلک کرے چھپ چھپ کے نغمہ پیرائی
وہ دیکھ سامنے کے پُرشکوہ ایواں سے
کسی کرائے کی لڑکی کی چیخ ٹکرائی
وہ پھر سماج نے دو پیار کرنے والوں کو
سزا کے طور پہ بخشی طویل تنہائی

پھر ایک تیرہ و تاریک جھونپڑی کے تلے
سسکتے بچے پہ بیوہ کی آنکھ بھر آئی
وہ پھر بکی کسی مجبور کی جواں بیٹی!
وہ پھر جھکا کسی در پر غرورِ برنائی
وہ پھر کسانوں کے مجمع پہ گن مشینوں سے
حقوق یافتہ طبقے نے آگ برسائی
سکوتِ حلقۂ زنداں سے ایک گونج اُٹھی
اور اس کے ساتھ مرے ساتھیوں کی یاد آئی
نہیں نہیں مجھے یوں ملتفت نظر سے نہ دیکھ
نہیں نہیں مجھے اب تابِ نغمہ پیرائی
مرا جنونِ وفا ہے زوال آمادہ
شکست ہو گیا تیرا فسونِ زیبائی

# کچھ باتیں

دیس کے ادبار کی باتیں کریں
اجنبی سرکار کی باتیں کریں

اگلی دنیا کے فسانے چھوڑ کر
اس جہنم زار کی باتیں کریں

ہو چکے اوصاف پردے کے بیاں
شاہدِ بازار کی باتیں کریں

دہر کے حالات کی باتیں کریں
اس مسلسل رات کی باتیں کریں

من و سلویٰ کا زمانہ جا چکا
بھوک اور آفات کی باتیں کریں

آؤ پرکھیں دین کے اوہام کو
علمِ موجودات کی باتیں کریں

جابر و مجبور کی باتیں کریں
اس کہن دستور کی باتیں کریں

تاجِ شاہی کے قصیدے ہو چکے
فاقہ کش جمہور کی باتیں کریں

گرنے والے قصر کی توصیف کیا
تیشۂ مزدور کی باتیں کریں

# چکلے

یہ کوچے یہ نیلام گھر دلکشی کے
یہ لٹتے ہوئے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں کہاں ہیں محافظ خودی کے
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہ پُرپیچ گلیاں یہ بے خواب بازار
یہ گمنام راہی یہ سکّوں کی جھنکار
یہ عصمت کے سودے یہ سودوں پہ تکرار
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

تعفّن سے پُرنیم روشن یہ گلیاں
یہ مَسلی ہوئی اَدھ کھِلی زرد کلیاں
یہ بکتی ہوئی کھوکھلی رنگ رلیاں
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

وہ اُجلے دریچوں میں پائل کی چھن چھن
تنفّس کی اُلجھن پہ طبلے کی دھن دھن
یہ بے رُوح کمروں میں کھانسی کی ٹھن ٹھن
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہ گونجے ہوئے قہقہے راستوں پر
یہ چاروں طرف بھیڑ سی کھڑکیوں پر
یہ آوازے کھنچتے ہوئے آنچلوں پر
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہ پھولوں کے گجرے یہ پیکوں کے چھینٹے
یہ بے باک نظریں یہ گستاخ فقرے
یہ ڈھلکے بدن اور یہ مدقوق چہرے
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہ بھوکی نگاہیں حسینوں کی جانب
یہ بڑھتے ہوئے ہاتھ سینوں کی جانب
لپکتے ہوئے پاؤں زینوں کی جانب
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

یہاں پیر بھی آ چکے ہیں جواں بھی
تنومند بیٹے بھی، ابا میاں بھی
یہ بیوی بھی ہے اور بہن بھی ہے ماں بھی
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

مدد چاہتی ہے یہ حوّا کی بیٹی
یشودھا کی ہم جنس رادھا کی بیٹی
پیمبر کی اُمت، زلیخا کی بیٹی
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

بلاؤ خدایانِ دیں کو بلاؤ
یہ کوچے، یہ گلیاں، یہ منظر دکھاؤ
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کو لاؤ
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں؟

# طرحِ نو

سعیٔ بقائے شوکتِ اسکندری کی خیر
ماحولِ خشت بار میں شیشہ گری کی خیر

بیزار ہے کنشت و کلیسا سے اک جہاں
سوداگرانِ دین کی سوداگری کی خیر

فاقہ کشوں کے خون میں ہے جوشِ انتقام
سرمایہ کے فریب جہاں پروری کی خیر

طبقاتِ مبتذل میں ہے تنظیم کی نمود
شاہنشہوں کے ضابطۂ خود سری کی خیر

احساس بڑھ رہا ہے حقوقِ حیات کا
پیدائشی حقوقِ ستم پروری کی خیر

ابلیس خندہ زن ہے مذاہب کی لاش پر
پیغمبرانِ دہر کی پیغمبری کی خیر

صحنِ جہاں میں رقص کناں ہیں تباہیاں
آقائے ہست و بود کی صنعت گری کی خیر

شعلے لپک رہے ہیں جہنم کی گود سے
باغِ جناں میں جلوۂ حور و پری کی خیر

انساں اُلٹ رہا ہے رُخِ زیست سے نقاب
مذہب کے اہتمامِ فسوں پروری کی خیر

الحاد کر رہا ہے مُرتب جہانِ نَو
دیر و حرم کے حیلۂ غارت گری کی خیر

# تاج محل

تاج تیرے لئے اک مظہرِ الفت ہی سہی
تجھ کو اس وادیٔ رنگیں سے عقیدت ہی سہی
میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے

بزمِ شاہی میں غریبوں کا گزر کیا معنی ؟
ثبت جس راہ میں ہُوں سطوتِ شاہی کے نشاں
اس پہ الفت بھری رُوحوں کا سفر کیا معنی ؟
میری محبوب پسِ پردۂ تشہیرِ وفا
تُو نے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھا ہوتا
مُردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا
ان گنت لوگوں نے دنیا میں محبت کی ہے
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے اُنکے
لیکن اُن کے لئے تشہیر کا سامان نہیں
کیونکہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مُفلس تھے

یہ عمارات و مقابر یہ فصیلیں یہ حصار
مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستوں
سینۂ دہر کے ناسور ہیں کہنہ ناسور
جذب ہے ان میں ترے اور مرے اجداد کا خوں

میری محبوب! انہیں بھی تو محبت ہوگی!
جن کی صناعی نے بخشی ہے اسے شکلِ جمیل
ان کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام و نمود
آج تک ان پہ جلائی نہ کسی نے قندیل
یہ چمن زار یہ جمنا کا کنارہ، یہ محل
یہ منقّش در و دیوار یہ محراب یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

میری محبوب! کہیں اور مِلا کر مجھ سے

# لمحۂ غنیمت

مُسکرا اے زمینِ تیرہ و تار
سر اُٹھا اے دَبی ہوئی مخلوق

دیکھ وہ مغربی اُفق کے قریب
آندھیاں پیچ و تاب کھانے لگیں

اور پُرانے قمار خانے میں
کہنہ شاطر بہم اُلجھنے لگے

کوئی تیری طرف نہیں نگراں
یہ گراں بار، سرد زنجیریں

زنگ خوردہ ہیں، آہنی ہی سہی
آج موقع ہے، ٹوٹ سکتی ہیں

فرصتِ یک نفس غنیمت جان
سر اُٹھا، اے دبی ہوئی مخلوق

# طلوعِ اشتراکیت

جشن بپا ہے کٹیاؤں میں، اونچے ایواں کانپ رہے ہیں
مزدوروں کے بگڑے تیور دیکھ کے سلطاں کانپ رہے ہیں
جاگے ہیں افلاس کے مارے، اُٹھے ہیں بے بس دکھیارے
سینوں میں طوفاں کا تلاطم، آنکھوں میں بجلی کے شرارے
چوک چوک پر گلی گلی میں سُرخ پھریرے لہراتے ہیں
مظلوموں کے باغی لشکر سیل صفت اُمڈے آتے ہیں
شاہی درباروں کے دَر سے فوجی پہرے ختم ہوئے ہیں
ذاتی جاگیروں کے حق اور مہمل دعوے ختم ہوئے ہیں
شور مچا ہے بازاروں میں، ٹوٹ گئے در زندانوں کے
واپس مانگ رہی ہے دنیا غصب شدہ حق انسانوں کے
رُسوا بازاری خاتونیں حقِ نسائی مانگ رہی ہیں
صدیوں کی خاموش زبانیں سحر نوائی مانگ رہی ہیں

روندی کچلی آوازوں کے شور سے دھرتی گونج اُٹھی ہے
دنیا کے ابنائے نگر میں حق کی پہلی گونج اُٹھی ہے
جمع ہوئے ہیں چوراہوں پر آکے بھوکے اور گداگر
ایک لپکتی آندھی بن کر ایک بھبکتا شعلہ ہو کر
کاندھوں پر سنگین کدالیں ہونٹوں پر بے باک ترانے
دہقانوں کے دل نکلے ہیں اپنی بگڑی آپ بنانے
آج پرانی تدبیروں سے آگ کے شعلے تھم نہ سکیں گے
اُبھرے جذبے دَب نہ سکیں گے اکھڑے پرچم جم نہ سکیں گے
راج محل کے دربانوں سے یہ سرکش طوفاں نہ رُکے گا
چند کرائے کے تنکوں سے سیلِ بے پایاں نہ رُکے گا
کانپ رہے ہیں ظالم سلطاں ٹوٹ گئے دل جبّاروں کے
بھاگ رہے ہیں ظلِ الٰہی مُنہ اُترے ہیں غدّاروں کے
ایک نیا سورج چمکا ہے، ایک انوکھی ضوباری ہے
ختم ہوئی افراد کی شاہی، اب جمہور کی سالاری ہے

# اجنبی محافظ

اجنبی دیس کے مضبوط گرانڈیل جوان
اونچے ہوٹل کے درِ خاص پہ اِستادہ ہیں
اور نیچے مِرے مجبور وطن کی گلیاں
جن میں آوارہ پھرا کرتے ہیں بھوکوں کے ہجوم
زرد چہروں پر نقاہت کی نمود
خون میں سینکڑوں سالوں کی غلامی کا جمود
علم کے نُور سے عاری ـــــــ محروم
فلکِ ہند کے افسردہ ـــــــ نجوم
جن کی تخیّل کے پر
چھو نہیں سکتے ہیں اس اونچی پہاڑی کا سرا
جس پہ ہوٹل کے دریچوں میں کھڑے ہیں تن کر
اجنبی دیس کے مضبوط گرانڈیل جواں
منہ میں سگریٹ لیے ہاتھوں میں برانڈی کا گلاس

جیب میں نقرئی سکوں کی کھنک
بھوکے دہقانوں کے ماتھے کا عرق
رات کو جس کے عوض بکتا ہے
کسی افلاس کی ماری کا تقدس ـــــ یعنی
کسی دوشیزۂ مجبور کی عصمت کا غرور
محفلِ عیش کے گونجے ہوئے ایوانوں میں
اونچے ہوٹل کے شبستانوں میں
قہقہے مارتے ہنستے ہوئے استادہ ہیں
اجنبی دیس کے مضبوط گرانڈیل جواں
اسی ہوٹل کے قریب
بھوکے مجبور غلاموں کے گروہ
ٹکٹکی باندھ کے تکتے ہوئے اوپر کی طرف
منتظر بیٹھے ہیں اس ساعتِ نایاب کے جب
بوٹ کی نوک سے نیچے پھینکے
اجنبی دیس کے بے فکر جوانوں کا گروہ
کوئی سکہ، کوئی سگریٹ، کوئی کیک

یا ڈبل روٹی کے جھوٹے ٹکڑے
پھینا جھپٹی کے مناظر کا مزہ لینے کو
پالتو کتّوں کے احساس پہ ہنس دینے کو
بھوکے مجبور غلاموں کا گروہ
ٹکٹکی باندھ کے تکتا ہوا استادہ ہے
کاش یہ بے حس و بے وقعت و بیدل انساں
روم کے ظلم کی زندہ تصویر
اپنا ماحول بدل دینے کے قابل ہوتے
ڈیڑھ سو سال کے پابندِ سلاسل کتّے
اپنے آقاؤں سے لے سکتے خراجِ قوّت
کاش یہ اپنے لیے آپ صف آرا ہوتے
اپنی تکلیف کا خود آپ مداوا ہوتے
ان کے دل میں ابھی باقی رہتا
قومی غیرت کا وجود

ان کے سنگین و سیہ سینوں میں
گُل نہ ہوتی ابھی احساس کی شمع
اور پورب سے اُمڈتے ہوئے خطرے کے لیے
یہ کرائے کے محافظ نہ منگانے پڑتے

# بُلاوا

دیکھو دُور اُفق کی ضو سے جھانک رہا ہے سُرخ سویرا
جاگو اے مزدُور کِسانو!
اُٹھو اے مظلوم اِنسانو!

دھرتی کے اَن داتا تُم ہو — جُگ کے پران ددھاتا تُم ہو
دھنیوں کی خوشحالی تم ہو — کھیتوں کی ہریالی تُم ہو
اونچے محل بنائے تم نے — شاہی تخت سجائے تُم نے
ہیرے لعل نکالے تُم نے — نیزے بھالے ڈھالے تم نے
ہر بگیا کے مالی تم ہو — اس سنسار کے والی تم ہو
وقت ہے دھرتی کو اپنا لو — آگے بڑھو ہتھیار سنبھالو

اٹھو اے مظلوم انسانو
جاگو اے مزدور کِسانو

دیکھو دھرتی کانپ رہی ہے　　گرد پھریرے ڈھانپ رہی ہے
کشٹ کی جوالا پھوٹ پڑی ہے　　وقت ہے تھوڑا جنگ کڑی ہے
پھیل رہے ہیں کال کے گھیرے　　تھامو اپنے سُرخ پھریرے
تم ہو جگ جنتا کے سینک　　پاپ کے ناشک ستیہ کے رکھشک
بھوک کے عادی ظلم کے پالے　　کالی کٹیاؤں کے اُجالے
کیا روکے گی تم کو شاہی　　تم ہو بہادر سُرخ سپاہی

جاگو اے مزدور کسانو
اُٹھو اے مظلوم انسانو
دیکھو دُور افق کی ضو سے جھانک رہا ہے سُرخ سویرا

# شہزادے

ذہن میں عظمتِ اجداد کے قصّے لے کر
اپنے تاریک گھروندوں کے خلا میں کھو جاؤ
مرمریں خوابوں کی پریوں سے لپٹ کر سو جاؤ
ابر پاروں پہ چلو، چاند ستاروں میں اُڑو
یہی اجداد سے ورثہ میں ملا ہے تم کو
دور مغرب کی فضاؤں میں دہکتی ہوئی آگ
اہلِ سرمایہ کی آویزشِ باہم نہ سہی
جنگِ سرمایہ و محنت ہی سہی
دور مغرب میں ہے ــــــ مشرق کی فضا میں تو نہیں
تم کو مغرب کے بکھیڑوں سے بھلا کیا لینا؟

تیرگی ختم ہوئی سُرخ شعاعیں پھیلیں
دورِ مغرب کی فضاؤں میں ترانے گونجے
فتح جمہور کے، انصاف کے، آزادی کے
ساحلِ شرق پہ گیسوں کا دُھواں چھانے لگا
آگ برسانے لگے اجنبی توپوں کے دہن
خواب گاہوں کی چھتیں گرنے لگیں
اپنے بستر سے اُٹھو
نئے آقاؤں کی تعظیم کرو
اور ـــــ پھر اپنے گھروندوں کے خلا میں کھو جاؤ
تم بہت دیر ـــــ بہت دیر تلک سوتے رہے

# شعاعِ فردا

تیرہ و تار فضاؤں میں ستم خوردہ بشر
اور کچھ دیر اُجالے کے لئے ترسے گا
اور کچھ دیر اُٹھے گا دلِ گیتی سے دھواں
اور کچھ دیر فضاؤں سے لہُو برسے گا

اور پھر احمریں ہونٹوں کے تبسّم کی طرح
رات کے چاک سے پھوٹے گی شعاعوں کی لکیر
اور جمہُور کے بیدار تعاون کے طفیل
ختم ہو جائے گی انساں کے لہُو کی تقطیر

اور کچھ دیر بھٹک لے مرے درماندہ ندیم
اور کچھ دن ابھی زہراب کے ساغر پی لے
نُور افشاں چلی آتی ہے عروسِ فردا
حال تاریک و سم افشاں سہی لیکن جی لے

# بنگال

جہانِ کہنہ کے مفلوج فلسفہ دانو!
نظامِ نو کے تقاضے سوال کرتے ہیں
یہ شاہراہیں اسی واسطے بنی تھیں کیا؟
کہ ان پہ دیس کی جنتا سِسک سِسک کے مرے
زمیں نے کیا اسی کارن اناج اُگلا تھا
کہ نسلِ آدم و حوّا بِلک بِلک کے مرے
مِلیں اسی لیے ریشم کے ڈھیر بُنتی ہیں
کہ دخترانِ وطن تار تار کو ترسیں

چمن کو اس لیے مالی نے خوں سے سینچا تھا؟
کہ اس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں
زمیں کی قوّتِ تخلیق کے خداوندو!
ملوں کے منتظمو! سلطنت کے فرزندو
پچاس لاکھ فسردہ گلے سڑے ڈھانچے
نظامِ زر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں
خموش ہونٹوں سے دم توڑتی نگاہوں سے
بشر بشر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں

# فن کار

میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے
آج ان گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں

آج دکان پہ نیلام اُٹھے گا اُن کا
تُو نے جن گیتوں پہ رکھی تھی محبت کی اساس

آج چاندی کے ترازو میں تُلے گی ہر چیز
میرے افکار، مری شاعری، میرا احساس

جو تری ذات سے منسُوب تھے ان گیتوں کو
مُفلسی جنس بنانے پہ اُتر آئی ہے

بھوک تیرے رُخِ رنگیں کے فسانوں کے عِوض
چند اشیائے ضرورت کی تمنائی ہے

دیکھ اس عرصہ گہہِ محنت و سرمایہ میں
میرے نغمے بھی مرے پاس نہیں رہ سکتے

تیرے جلوے کسی زردار کی میراث سہی
تیرے خاکے بھی مرے پاس نہیں رہ سکتے

آج ان گیتوں کو بازار میں لے آیا ہُوں
میں نے جو گیت ترے پیار کی خاطر لکھے

# کبھی کبھی

کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
کہ زندگی تری زلفوں کی نرم چھاؤں میں
گزرنے پاتی تو شاداب ہو بھی سکتی تھی

یہ تیرگی جو مری زیست کا مقدّر ہے
تری نظر کی شعاعوں میں کھو بھی سکتی تھی

عجب نہ تھا کہ میں بیگانۂ الم ہو کر
ترے جمال کی رعنائیوں میں کھو رہتا

ترا گُداز بدن، تیری نیم باز آنکھیں
انہی حسین فسانوں میں محو ہو رہتا

پکارتیں مجھے جب تلخیاں زمانے کی
ترے لبوں سے حلاوت کے گھونٹ پی لیتا

حیات چیختی پھرتی برہنہ سر اور میں
گھنیری زلفوں کے سائے میں چھپ کے جی لیتا

مگر یہ ہو نہ سکا اور اب یہ عالم ہے
کہ تو نہیں ترا غم، تیری جستجو بھی نہیں

گزر رہی ہے کچھ اس طرح زندگی جیسے
اسے کسی کے سہارے کی آرزو بھی نہیں

زمانے بھر کے دکھوں کو لگا چکا ہوں گلے
گزر رہا ہوں کچھ انجانی رہ گزاروں سے

مہیب سائے مِری سمت بڑھتے آتے ہیں
حیات و موت کے پُر ہول خارزاروں سے

نہ کوئی جادۂ منزل نہ روشنی کا سراغ
بھٹک رہی ہے خلاؤں میں زندگی میری

انہی خلاؤں میں رہ جاؤں گا کبھی کھو کر
میں جانتا ہوں مری ہم نفس مگر یونہی
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے

# فرار

اپنے ماضی کے تصوّر سے ہراساں ہوں مَیں
اپنے گزرے ہُوئے ایام سے نفرت ہے مجھے
اپنی بے کار تمناؤں پہ شرمندہ ہُوں
اپنی بے سُود امیدوں پہ ندامت ہے مجھے

میرے ماضی کو اندھیرے میں دبا رہنے دو
میرا ماضی مری ذلّت کے سوا کچھ بھی نہیں
میری امیدوں کا حاصل مری کاوش کا صلہ
ایک بے نام اذیّت کے سوا کچھ بھی نہیں

کتنی بے کار اُمیدوں کا سہارا لے کر
میں نے ایوان سجائے تھے کسی کی خاطر
کتنی بے رَبط تمناؤں کے مُبہم خاکے
اپنے خوابوں میں بسائے تھے کسی کی خاطر

مُجھ سے اب میری محبت کے فسانے نہ کہو
مجھ کو کہنے دو کہ میں نے انہیں چاہا ہی نہیں
اور وہ مَست نگاہیں جو مجھے بھول گئیں
میں نے ان مَست نِگاہوں کو سراہا ہی نہیں

مجھ کو کہنے دو کہ میں آج بھی جی سکتا ہوں
عشق ناکام سہی ، زندگی ناکام نہیں
ان کو اپنانے کی خواہش انہیں پانے کی طلب
شوقِ بے کار سہی، سعئ غم انجام نہیں

وہی گیسو، وہی نظریں ، وہی عارض، وہی جسم
میں جو چاہوں تو مجھے اور بھی مِل سکتے ہیں
وہ کنول جن کو کبھی ان کے لئے کھِلنا تھا
ان کی نظروں سے بہت دُور بھی کھل سکتے ہیں

# کل اور آج

کل بھی بوندیں برسی تھیں
کل بھی بادل چھائے تھے
اور کوی نے سوچا تھا —

بادل یہ آکاش کے سپنے ان زلفوں کے سائے ہیں
دوش ہوا پر میخانے ہی میخانے گھر آئے ہیں
رُت بدلیگی پھول کھلیں گے جھونکے مدھ برسائیں گے
اُجلے اُجلے کھیتوں میں رنگین آنچل لہرائیں گے
چرواہے بنسی کی دُھن سے گیت فضا میں بوئیں گے
آموں کے جھنڈوں کے نیچے پردیسی دل کھوئیں گے
پینگ بڑھاتی گوری کے ماتھے سے کوندے لپکیں گے
جوہڑ کے ٹھہرے پانی میں تارے آنکھیں جھپکیں گے
اُلجھی اُلجھی راہوں میں وہ آنچل تھامے آئیں گے
دھرتی، پھول، آکاش، ستارے سپنا سا بن جائیں گے

کل بھی بوندیں برسی تھیں
کل بھی بادل چھائے تھے

— اور کوئی نے سوچا تھا

(۲)

آج بھی بوندیں برسیں گی
آج بھی بادل چھائے ہیں
— اور کوئی اس سوچ میں ہے

بستی پر بادل چھائے ہیں پر یہ بستی کس کی ہے
دھرتی پر امرت برسے گا لیکن دھرتی کس کی ہے
ہل جوتے گی کھیتوں میں الہڑ ٹولی دہقانوں کی
دھرتی سے پھوٹے گی محنت فاقہ کش انسانوں کی
فصلیں کاٹ کے محنت کش غلے کے ڈھیر لگائیں گے
جاگیروں کے مالک آکر سب پونجی لے جائیں گے
بوڑھے دہقانوں کے گھر بنیئے کی قرقی آئے گی
اور قرضے کے سود میں کوئی گوری بیچی جائے گی
آج بھی جنتا بھوکی ہے کل بھی جنتا ترسی تھی
آج بھی رم جھم برکھا ہوگی کل بھی بارش برسی تھی

آج بھی بادل چھائے ہیں
آج بھی بوندیں برسیں گی
— اور کوئی اس سوچ میں ہے

# ہراس

تیرے ہونٹوں پہ تبسّم کی وہ ہلکی سی لکیر
میرے تخئیل میں رہ رہ کے جھلک اٹھتی ہے
یُوں اچانک ترے عارض کا خیال آتا ہے
جیسے ظُلمت میں کوئی شمع بھڑک اُٹھتی ہے

تیرے پیراہنِ رنگیں کی جنوں خیز مہک
خواب بن بن کے مِرے ذہن میں لہراتی ہے
رات کی سرد خموشی میں ہر اِک جھونکے سے
تیرے انفاس، ترے جسم کی آنچ آتی ہے

میں سُلگتے ہوئے رازوں کو عیاں تو کر دُوں
لیکن ان رازوں کی تشہیر سے جی ڈرتا ہے
رات کے خواب اُجالے میں بیاں تو کر دُوں
ان حسیں خوابوں کی تعبیر سے جی ڈرتا ہے

تیری سانسوں کی تھکن، تیری نگاہوں کا سکوت
درحقیقت کوئی رنگین شرارت ہی نہ ہو
میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہُوں
وہ تبسم، وہ تکلم تری عادت ہی نہ ہو

سوچتا ہوں کہ تجھے مِل کے میں جس سوچ میں ہُوں
پہلے اس سوچ کا مقسوم سمجھ لُوں تو کہوں
میں ترے شہر میں انجان ہُوں پردیسی ہُوں
تیرے الطاف کا مفہوم سمجھ لُوں تو کہوں

کہیں ایسا نہ ہو پاؤں مرے تھرّا جائیں
اور تری مرمریں باہوں کا سہارا نہ مِلے
اشک بہتے رہیں خاموش سیہ راتوں میں
اور ترے ریشمی آنچل کا کنارا نہ مِلے

# اِسی دوراہے پر

اب نہ اُن اونچے مکانوں میں قدم رکھوں گا
میں نے اک بار یہ پہلے بھی قسم کھائی تھی
اپنی نادار محبّت کی شکستوں کے طفیل
زندگی پہلے بھی شرمائی تھی جھنجھلائی تھی

اور یہ عہد کیا تھا کہ بہ ایں حالِ تباہ
اب کبھی پیار بھرے گیت نہیں گاؤں گا
کسی چلمن نے پکارا بھی تو بڑھ جاؤں گا
کوئی دروازہ کھُلا بھی تو پلٹ آؤں گا

پھر ترے کانپتے ہونٹوں کی فسوں کار ہنسی
جال بُننے لگی، بُنتی رہی، بُنتی ہی رہی
میں کھنچا تجھ سے، مگر تو مری راہوں کیلئے
پھول چُنتی رہی، چُنتی رہی، چُنتی ہی رہی

برف برسائی مرے ذہن و تصور نے مگر
دل میں اک شعلۂ بے نام سا لہرا ہی گیا
تیری چپ چاپ نگاہوں کو سلگتے پا کر
میری بیزار طبیعت کو بھی پیار آ ہی گیا

اپنی بدلی ہوئی نظروں کے تقاضے نہ چھپا
میں اس انداز کا مفہوم سمجھ سکتا ہوں
تیرے زرکار دریچوں کی بلندی کی قسم
اپنے اقدام کا مقسوم سمجھ سکتا ہوں

اب نہ ان اونچے مکانوں میں قدم رکھوںگا
میں نے اک بار یہ پہلے بھی قسم کھائی تھی
اسی سرمایہ و افلاس کے دوراہے پر
زندگی پہلے بھی شرمائی تھی جھنجھلائی تھی

# ایک تصویر رنگ

میں نے جس وقت تجھے پہلے پہل دیکھا تھا
تو جوانی کا کوئی خواب نظر آئی تھی
حُسن کا نغمۂ جاوید ہوئی تھی معلوم
عشق کا جذبۂ بے تاب نظر آئی تھی

اے طرب زارِ جوانی کی پریشاں تتلی
تو بھی اِک بوئے گرفتار ہے معلوم نہ تھا
تیرے جلوؤں میں بہاریں نظر آتی تھیں مجھے
تُو ستم خوردۂ ادبار ہے معلوم نہ تھا

تیرے نازک سے پروں پر یہ زر و سیم کا بوجھ
تیری پرواز کو آزاد نہ ہونے دے گا
تُو نے راحت کی تمنا میں جو غم پالا ہے
وہ تری رُوح کو آباد نہ ہونے دے گا

تُو نے سرمائے کی چھاؤں میں پنپنے کے لیے
اپنے دل، اپنی محبّت کا لہو بیچا ہے
دن کی تزئینِ فسردہ کا اثاثہ لیکر
شوخ راتوں کی مسرّت کا لہو بیچا ہے

زخم خوردہ ہیں تخیّل کی اُڑانیں تیری
تیرے گیتوں میں تری رُوح کے غم پلتے ہیں
سرمگیں آنکھوں میں یوں حسرتیں لَو دیتی ہیں
جیسے ویران مزاروں پہ دِیئے جلتے ہیں

اس سے کیا فائدہ؟ رنگین لبادوں کے تلے
رُوح جلتی رہے، گھلتی رہے، پژمردہ رہے
ہونٹ ہنستے ہُوں دکھاوے کے تبسّم کے لئے
دل غمِ زیست سے بوجھل رہے، آزردہ رہے

دل کی تسکین بھی ہے آسائشِ ہستی کی دلیل
زندگی صرف زر و سیم کا پیمانہ نہیں
زیستِ احساس بھی ہے، شوق بھی ہے، درد بھی ہے
صرف انفاس کی ترتیب کا افسانہ نہیں

عمر بھر رینگتے رہنے سے کہیں بہتر ہے
ایک لمحہ جو تری رُوح میں وسعت بھر دے
ایک لمحہ جو ترے گیت کو شوخی دے دے
ایک لمحہ جو تری لَے میں مسرّت بھر دے

# ایک شام

قمقموں کی زہر اُگلتی روشنی
سنگ دل پُر ہول دیواروں کے سائے
آہنی بُت ، دیو پیکر اجنبی
چیختی چنگھاڑتی خونیں سرائے

روح اُلجھی جا رہی ہے کیا کروں
چار جانب ارتعاشِ رنگ و نُور
چار جانب اجنبی بانہوں کے جال
چار جانب خوں فشاں پرچم بلند
میں، مری غیرت، مرا دستِ سوال
زندگی شرما رہی ہے، کیا کروں

کارگاہِ زیست کے ہر موڑ پر
روحِ چنگیزی برافگندہ نقاب
تھام اے صبحِ جہانِ نَو کی ضوٗ
جاگ اے مستقبلِ انساں کے خواب

آس ڈوبی جا رہی ہے کیا کروں

# احساسِ کامراں

اُفقِ روس سے پھُوٹی ہے نئی صبح کی ضو
شب کا تاریک جگر چاک ہوا جاتا ہے
تیرگی جتنا سنبھلنے کے لیے رُکتی ہے
سُرخ سَیل اور بھی بے باک ہوا جاتا ہے

سامراج اپنے وسیلوں پہ بھروسہ نہ کرے
کہنہ زنجیروں کی جھنکاریں نہیں رہ سکتیں
جذبۂ نفرتِ جمہور کی بڑھتی رَو میں
ملک اور قوم کی دیواریں نہیں رہ سکتیں

سنگ و آہن کی چٹانیں ہیں عوامی جذبے
موت کے رینگتے سایوں سے کہو ہٹ جائیں
کروٹیں لے کے مچلنے کو ہے سَیلِ انوار
تیرہ و تار گھٹاؤں سے کہو چھٹ جائیں

سالہا سال کے بے چین شراروں کا خروش
اک نئی زیست کا در باز کیا چاہتا ہے
عزمِ آزادیٔ انساں بہ ہزاراں جبروت
اک نئے دَور کا آغاز کیا چاہتا ہے

بر تر اقوام کے مغرور خداؤں سے کہو
آخری بار ذرا اپنا ترانہ دُھرائیں
اور پھر اپنی سیاست پہ پشیماں ہو کر
اپنے ناکام ارادوں کا کفن لے آئیں

سُرخ طوفان کی موجوں کو جکڑنے کے لیے
کوئی زنجیرِ گراں کام نہیں آسکتی
رقص کرتی ہوئی کرنوں کے تلاطم کی قسم
عرصۂ دہر پہ اب شام نہیں چھا سکتی

# میرے گیت تمھارے ہیں

اب تک میرے گیتوں میں اُمید بھی تھی پسپائی بھی
موت کے قدموں کی آہٹ بھی جیون کی انگڑائی بھی
مستقبل کی کرنیں بھی تھیں حال کی بوجھل ظلمت بھی
طوفانوں کا شور بھی تھا اور خوابوں کی شہنائی بھی

آج سے میں اپنے گیتوں میں آتش پارے بھر دُوں گا
مدھم، لچکیلی تانوں میں جیوٹ دھارے بھر دُوں گا
جیون کے اندھیارے پتھ پر مشعل لے کر نکلوں گا
دھرتی کے پھیلے آنچل میں سُرخ ستارے بھر دُوں گا

آج سے اے مزدور کسانو! میرے گیت تمہارے ہیں
فاقہ کش انسانو! میرے جوگ بہاگ تمہارے ہیں
جب تک تم بھوکے ننگے ہو، یہ نغمے خاموش نہ ہونگے
جب تک بے آرام ہو تم یہ نغمے راحت کوش نہ ہونگے

مجھ کو اس کا رنج نہیں ہے لوگ مجھے فنکار نہ مانیں
فکر و فن کے تاجر میرے شعروں کو اشعار نہ مانیں
میرا فن میری اُمیدیں، آج سے تم کو ارپن ہیں!
آج سے میرے گیت تمھارے دُکھ اور سکھ کا درپن ہیں

تم سے قوّت لے کر اب میں تم کو راہ دکھاؤں گا
تم پرچم لہرانا ساتھی! میں بربط پہ گاؤں گا
آج سے میرے فن کا مقصد زنجیریں پگھلانا ہے
آج سے میں شبنم کے بدلے انگارے برساؤں گا

اپنی تباہیوں کا مجھے کوئی غم نہیں
تم نے کسی کے ساتھ محبّت نبھا تو دی

# مَیں نہیں تو کیا؟

مرے لئے یہ تکلّف، یہ دُکھ، یہ حسرت کیوں
مری نگاہِ طلب، آخری نگاہ نہ تھی
حیات زارِ جہاں کی طویل راہوں میں
ہزار دیدۂ حیراں فسوں بکھیریں گے
ہزار چشم تمنّا بنے گی دستِ سوال
نکل کے خلوتِ غم سے نظر اٹھاؤ تو
وہی شفق ہے وہی ضو ہے، میں نہیں تو کیا؟

مرے بغیر بھی تم کامیابِ عشرت تھیں
مرے بغیر بھی آباد تھے نشاط کدے
مرے بغیر بھی تم نے دِیے جلائے ہیں
مرے بغیر بھی دیکھا ہے ظلمتوں کا نزول

مرے نہ ہونے سے اُمید کا زیاں کیوں ہو
بڑھی چلو مئے عشرت کے جام چھلکاتی
تمھاری سیج، تمھارے بدن کے پھولوں پر
اسی بہار کا پرتو ہے، میں نہیں تو کیا؟

مرے لئے یہ اداسی، یہ سوگ کیوں آخر
ملیح چہرے پہ گردِ فسردگی کیسی
بہارِ غازہ سے عارض کو تازگی بخشو
علیل آنکھوں میں کاجل لگاؤ رنگ بھرو
سیاہ جوڑے میں کلیوں کی کہکشاں گوندھو
ھزارہا تپتے سینے ہزار کانپتے لب
تمھاری چشمِ توجہ کے منتظر ہیں ابھی
جلو میں نغمہ و رنگ و بہار و نور لیے
حیات گرمِ تگ و دو ہے میں نہیں تو کیا؟

# خودکشی سے پہلے

اُف یہ بے درد سیاہی یہ ہوا کے جھونکے
کس کو معلوم ہے اس شب کی سحر ہو کہ نہ ہو
اِک نظر تیرے دریچے کی طرف دیکھ تو لوں
ڈوبتی آنکھوں میں پھر تابِ نظر ہو کہ نہ ہو

ابھی روشن ہیں ترے گرم شبستاں کے دیے
نیلگوں پردوں سے چھنتی ہیں شعائیں اب تک
اجنبی بانہوں کے حلقے میں لچکتی ہوں گی
تیرے مہکے ہوئے بالوں کی ردائیں اب تک

سرد ہوتی ہوئی بتی کے دھوئیں کے ہمراہ
ہاتھ پھیلائے بڑھے آتے ہیں بوجھل سائے
کون پونچھے مری آنکھوں کے سُلگتے آنسو
کون اُلجھے ہوئے بالوں کی گرہ سلجھائے

آہ یہ غارِ ہلاکت، یہ دیئے کا محبس
عمر اپنی انہی تاریک مکانوں میں کٹی
زندگی فطرتِ بے حس کی پُرانی تقصیر
اِک حقیقت تھی مگر چند فسانوں میں کٹی

کتنی آسائشیں ہنستی رہیں ایوانوں میں
کتنے در میری جوانی پہ سدا بند رہے
کتنے ہاتھوں نے بُنا اطلس و کمخواب مگر
میرے ملبوس کی تقدیر میں پیوند رہے
ظُلم سہتے ہوئے انسانوں کے اس مقتل میں
کوئی فردا کے تصور سے کہاں تک بہلے
عمر بھر رینگتے رہنے کی سزا ہے جینا
ایک دو دن کی اذیت ہو تو کوئی سہہ لے

وہی ظُلمت ہے فضاؤں پہ ابھی تک طاری
جانے کب ختم ہو انساں کے لہو کی تقطیر
جانے کب نکھرے سیہ پوش فضا کا جوبن
جانے کب جاگے ستم خوردہ بشر کی تقدیر
ابھی روشن ہیں ترے گرم شبستاں کے دیئے
آج میں موت کے غاروں میں اُتر جاؤنگا
اور دم توڑتی بتّی کے دھوئیں کے ہمراہ
حدِ مرگِ مسلسل سے گزر جاؤنگا

# پھر وُہی کُنجِ قفس

چند لمحوں کے لئے شور اُٹھا ڈوب گیا
کہنہ زنجیرِ غلامی کی گرہ کٹ نہ سکی
پھر وہی سیلِ بلا ہے، وہی دامِ امواج
ناخداؤں میں سفینے کی جگہ بٹ نہ سکی

ٹوٹتے دیکھ کے دیرینہ تعطّل کا فسوں
نبضِ امیدِ وطن اُبھری، مگر ڈوب گئی
پیشواؤں کی نگاہوں میں تذبذب پاکر
ٹوٹتی رات کے سائے میں سحر ڈوب گئی

میرے محبوب وطن! تیرے مقدّر کے خُدا
دستِ اغیار میں قسمت کی عناں چھوڑ گئے
اپنی یک طرفہ سیاست کے تقاضوں کے طفیل
ایک بار اور تجھے نوحہ کناں چھوڑ گئے

پھر وہی گوشۂ زنداں ہے، وہی تاریکی
پھر وہی کہنہ سلاسل، وہی خونیں جھنکار
پھر وہی بھوک سے انساں کی ستیزہ کاری
پھر وہی ماؤں کے نوحے، وہی بچوں کی پکار
تیرے رہبر تجھے مرنے کے لئے چھوڑ چلے
ارضِ بنگال! انھیں ڈوبتی سانسوں سے پکار

بول! چیتگاؤں کی مظلوم خموشی کچھ بول
بول اے پیٹ سے رستے ہوئے سینوں کی بہار
بھوک اور قحط کے طوفان بڑھے آتے ہیں
بول اے عصمت وعفت کے جنازوں کی قطار

روک ان ٹوٹتے قدموں کو انھیں پوچھ ذرا
پوچھ اے بھوک سے دم توڑتے ڈھانچوں کی قطار
زندگی جبر کے سانچوں میں ڈھلیگی کب تک
ان فضاؤں میں ابھی موت پلے گی کب تک

# اشعار

نفس کے لوچ میں رَم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے
حیات، ساغرِ سم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

تری نگاہ مرے غم کی پاسدار سہی
مری نگاہ میں غم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

مری ندیم! محبت کی رفعتوں سے نہ گر
بلند بامِ حرم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

یہ اجتناب ہے عکسِ شعورِ محبوبی
یہ احتیاطِ ستم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

اِدھر بھی ایک اچٹتی نظر کہ دنیا میں
فروغِ محفلِ جسم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے
نئے جہان بسائے ہیں فکرِ آدم نے
اب اس زمیں پہ ارم ہی نہیں، کچھ اور بھی ہے
مرے شعور کو آوارہ کر دیا جس نے
وہ مرگِ شادی و غم ہی نہیں، کچھ اور بھی ہے

# نورجہاں کے مزار پر

پہلوئے شاہ میں یہ دُخترِ جمہور کی قبر
کتنے گم گشتہ فسانوں کا پتہ دیتی ہے
کتنے خوں ریز حقائق سے اٹھاتی ہے نقاب
کتنی کچلی ہوئی جانوں کا پتہ دیتی ہے

کیسے مغرور شہنشاہوں کی تسکیں کے لئے
سالہا سال حسیناؤں کے بازار لگے
کیسے بہکی ہوئی نظروں کے تعیش کے لئے
سُرخ محلوں میں جواں جسموں کے انبار لگے

کیسے ہر شاخ سے منہ بند مہکتی کلیاں
نوچ لی جاتی تھیں تزئین حرم کی خاطر
اور مرجھا کے بھی آزاد نہ ہو سکتی تھیں
ظلِّ سبحان کی الفت کے بھرم کی خاطر

کیسے اک فرد کے ہونٹوں کی ذرا سی جنبش
سرد کر سکتی تھی بے لوث وفاؤں کے چراغ
لوٹ سکتی تھی دمکتے ہوئے ہاتھوں کا سہاگ
توڑ سکتی تھی مئے عشق سے لبریز ایاغ

سہمی سہمی سی فضاؤں میں یہ ویراں مرقد
اتنا خاموش ہے فریاد کناں ہو جیسے
سرد شاخوں میں ہوا چیخ رہی ہے ایسے
روحِ تقدیس و وفا مرثیہ خواں ہو جیسے

تو مری جان! مجھے حیرت و حسرت سے نہ دیکھ
ہم میں کوئی بھی جہاں نور و جہاں گیر نہیں
تو مجھے چھوڑ کے ٹھکرا کے بھی جا سکتی ہے
تیرے ہاتھوں میں مرے ہاتھ ہیں زنجیر نہیں

# جاگیر

پھر اُسی وادیٔ شاداب میں لوٹ آیا ہُوں
جس میں پنہاں مرے خوابوں کی طرب گاہیں ہیں
میرے احباب کے سامانِ تعیش کے لئے
شوخ سینے ہیں، جواں جسم حسیں بانہیں ہیں

سبز کھیتوں میں یہ دبکی ہوئی دوشیزائیں
ان کی شریانوں میں کس کس کا لہو جاری ہے
کس میں جرأت ہے کہ اس راز کی تشہیر کرے
سب کے لب پر مری ہیبت کا فسوں طاری ہے

ہائے وہ گرم و دل آویز اُبلتے سینے
جن سے ہم سطوتِ آبا کا صلہ لیتے ہیں
جانے ان مرمریں جسموں کو یہ مریل دہقاں
کیسے ان تیرہ گھروندوں میں جنم دیتے ہیں

یہ لہکتے ہوئے پودے، یہ دمکتے ہوئے کھیت
پہلے اجداد کی جاگیر تھے اب میرے ہیں
یہ چراگاہ، یہ ریوڑ، یہ مویشی یہ کسان
سب کے سب میرے ہیں، سب میرے ہیں، سب میرے ہیں

ان کی محنت بھی مری، حاصلِ محنت بھی مرا
ان کے بازو بھی مرے قوتِ بازو بھی مری
میں خداوند ہوں اس وسعتِ بے پایاں کا
موجِ عارض بھی مری نکہتِ گیسو بھی مری

میں ان اجداد کا بیٹا ہوں جنہوں نے پیہم
اجنبی قوم کے سائے کی حمایت کی ہے
غدر کی ساعتِ ناپاک سے لے کر اب تک
ہر کڑے وقت میں سرکار کی خدمت کی ہے

خاک پر رینگنے والے یہ فسردہ ڈھانچے
ان کی نظریں کبھی تلوار بنی ہیں نہ بنیں
ان کی غیرت پہ ہر اک ہاتھ جھپٹ سکتا ہے
ان کے ابرو کی کمانیں نہ تنی ہیں نہ تنیں

ہائے یہ شام، یہ جھرنے، یہ شفق کی لالی
میں ان آسودہ فضاؤں میں ذرا جھوم نہ لوں
وہ دبے پاؤں ادھر کون چلی جاتی ہے
بڑھ کے اس شوخ کے ترشے ہوئے لب چوم نہ لوں

# مادام

آپ بے وجہ پریشان سی کیوں ہیں مادام
لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے
میرے احباب نے تہذیب نہ سیکھی ہو گی
میرے ماحول میں انسان نہ رہتے ہوں گے

نورِ سرمایہ سے ہے روئے تمدن کی جِلا
ہم جہاں ہیں وہاں تہذیب نہیں پل سکتی
مُفلسی حسِ لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی

لوگ کہتے ہیں تو لوگوں پہ تعجب کیسا
سچ تو کہتے ہیں کہ ناداروں کی عزت کیسی
لوگ کہتے ہیں، مگر آپ ابھی تک چُپ ہیں
آپ بھی کہیئے غریبوں میں شرافت کیسی

نیک مادام! بہت جلد وہ دَور آئے گا
جب ہمیں زلیست کے ادوار پرکھنے ہوں گے
اپنی ذلت کی قسم، آپ کی عظمت کی قسم
ہم کو تعظیم کے معیار پرکھنے ہوں گے

ہم نے ہر دَور میں تذلیل سہی ہے لیکن
ہم نے ہر دَور کے چہرے کو ضیا بخشی ہے
ہم نے ہر دَور میں محنت کے ستم جھیلے ہیں
ہم نے ہر دور کے ہاتھوں کو حنا بخشی ہے

لیکن ان تلخ مباحث سے بھلا کیا حاصل
لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے
میرے احباب نے تہذیب نہ سیکھی ہوگی
میں جہاں ہوں وہاں انسان نہ رہتے ہوں گے

وجۂ بے رنگیٔ گلزار کہوں یا نہ کہوں ! !
کون ہے کتنا گنہگار کہوں یا نہ کہوں ! !

# مفاہمت

نشیبِ ارض پہ ذروں کو مشتعل پا کر
بلندیوں پہ سفید و سیاہ مل ہی گئے
جو یادگار تھے باہم ستیزہ کاری کی
بہ فیضِ وقت وہ دامن کے چاک سِل ہی گئے

جہاد ختم ہوا دورِ آشتی آیا !
سنبھل کے بیٹھ گئے محملوں میں دیوانے
ہجومِ تشنہ لباں کی نگاہ سے اوجھل
چھلک رہے ہیں شراب ہوس کے پیمانے

یہ جشن، جشنِ مسرت نہیں، تماشا ہے
نئے لباس میں نکلا ہے رہزنی کا جلوس
ہزار شمعِ اخوت بجھا کے چمکے ہیں
یہ تیرگی کے اُبھارے ہوئے حسین فانوس
یہ شاخِ نور جسے ظلمتوں نے سینچا ہے
اگر پھلی تو شراروں کے پھول لائے گی
نہ پھل سکی تو نئی فصلِ گُل کے آنے تک
ضمیرِ ارض میں اِک زہر چھوڑ جائے گی

# آج

ساتھیو! میں نے برسوں تمھارے لئے
چاند، تاروں، بہاروں کے سپنے بُنے
حُسن اور عشق کے گیت گاتا رہا
آرزوؤں کے ایواں سجاتا رہا
میں تمھارا مغنی تمھارے لئے
جب بھی آیا نئے گیت لاتا رہا
آج لیکن مرے دامن چاک میں
گردِ راہِ سفر کے سوا کچھ نہیں
میرے بربط کے سینے میں نغموں کا دم گھٹ گیا
تانیں چیخوں کے انبار میں دب گئی ہیں
اور گیتوں کے سُر ہچکیاں بن گئے ہیں
میں تمھارا مغنی ہُوں، نغمہ نہیں ہُوں
اور نغمے کی تخلیق کا ساز و ساماں
ساتھیو! آج تم نے بھسم کر دیا ہے

اور میں اپنا ٹوٹا ہوا ساز تھامے
سرد لاشوں کے انبار کو تک رہا ہوں
میرے چاروں طرف موت کی وحشتیں ناچتی ہیں
اور انساں کی حیوانیت جاگ اُٹھی ہے
بربریت کے خوں خوار عفریت
اپنے ناپاک جبڑوں کو کھولے
خون پی پی کے غرّا رہے ہیں

بچے ماؤں کی گودوں میں سہمے ہوئے ہیں
عصمتیں سر برہنہ پریشان ہیں
ہر طرف شورِ آہ و بکا ہے
اور میں اس تباہی کے طوفان میں
آگ اور خوں کے ہیجان میں
سرنگوں اور شکستہ مکانوں کے ملبے سے پُر راستوں پر
اپنے نغموں کی جھولی پسارے
در بدر پھر رہا ہُوں!
مُجھ کو امن اور تہذیب کی بھیک دو

میرے گیتوں کی لَے، میرا سُر، میری نَے
میرے مجروح ہونٹوں کو پھر سونپ دو
ساتھیو! میں نے برسوں تمہارے لئے
انقلاب اور بغاوت کے نغمے الاپے
اجنبی راج کے ظُلم کی چھاؤں میں
سرفروشی کے خوابیدہ جذبے ابھارے
اور اس صبح کی راہ دیکھی!
جس میں اس ملک کی رُوح آزاد ہو
آج زنجیرِ محکومیت کٹ چکی ہے
اور اس ملک کے بحر و بر بام و در
اجنبی قوم کے ظُلمت افشاں پھریرے کی منحوس چھاؤں سے آزاد ہیں
کھیت سونا اُگلنے کو بے چین ہیں
وادیاں لہلہانے کو بے تاب ہیں
کوہساروں کے سینے میں ہیجان ہے
سنگ اور خشت بے خواب و بیدار ہیں
ان کی آنکھوں میں تعمیر کے خواب ہیں
ان کے خوابوں کو تکمیل کا روپ دو

مُلک کی وادیاں، گھاٹیاں، کھیتیاں
عورتیں بچیاں
ہاتھ پھیلائے خیرات کی منتظر ہیں
ان کو امن اور تہذیب کی بھیک دو
ماؤں کو ان کے ہونٹوں کی شادابیاں
ننھے بچوں کو ان کی خوشی بخش دو
مُلک کی روح کو زندگی بخش دو
مجھ کو میرا ہُنر میری لَے بخش دو
آج ساری فضا ہے بھکاری
اور میں اس بھکاری فضا میں
اپنے نغموں کی جھولی پسارے
در بدر پھر رہا ہُوں
مجھ کو پھر میرا کھویا ہوا ساز دو
میں تمھارا مغنّی تمھارے لیئے
جب بھی آیا نئے گیت لاتا رہوں گا

○

طرب زاروں پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گزری
دلِ زندہ! ترے مرحوم ارمانوں پہ کیا گزری

زمیں نے خون اگلا آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دل بدلے تو انسانوں پہ کیا گزری

ہمیں یہ فکر اُن کی انجمن کس حال میں ہوگی
انھیں یہ غم کہ اُن سے چھُٹ کے دیوانوں پہ کیا گزری

میرا الحاد تو خیر ایک لعنت تھا سو ہے اب تک
مگر اس عالمِ وحشت میں ایمانوں پہ کیا گزری

یہ منظر کون سا منظر ہے پہچانا نہیں جاتا
سیہ خانوں سے کچھ پوچھو شبستانوں پہ کیا گزری

چلو وہ کفر کے گھر سے سلامت آ گئے لیکن
خدا کی مملکت میں سوختہ جانوں پہ کیا گزری

# نیا سفر ہے پُرانے چراغ گُل کر دو

فریبِ جنتِ فردا کے جال ٹوٹ گئے
حیات اپنی امیدوں پہ شرمسار سی ہے
چمن میں جشنِ ورودِ بہار ہو بھی چکا
مگر نگاہِ گل و لالہ سوگوار سی ہے

فضا میں گرم بگولوں کا رقص جاری ہے
افق پہ خون کی مینا چھلک رہی ہے ابھی
کہاں کا مہرِ منوّر کہاں کی تنویریں
کہ بام و در پہ سیاہی جھلک رہی ہے ابھی

فضائیں سوچ رہی ہیں کہ ابنِ آدم نے
خرد گنوا کے جنوں آزما کے کیا پایا
وہی شکستِ تمنّا وہی غمِ ایّام!
نگارِ زیست نے سب کچھ لٹا کے کیا پایا

بھٹک کے رہ گئیں نظریں خلا کی وسعت میں
حریمِ شاہدِ رعنا کا کچھ پتہ نہ ملا
طویل راہ گزر ختم ہو گئی لیکن
ہنوز اپنی مسافت کا منتہا نہ ملا

سفر نصیب رفیقو! قدم بڑھائے چلو
پرانے راہنما لوٹ کر نہ دیکھیں گے
طلوعِ صبح سے تاروں کی موت ہوتی ہے
شبوں کے راج دُلارے اِدھر نہ دیکھیں گے

# شکستِ زنداں

چینی شاعر یانگ سو کے نام

جس نے چیانگ کائی شیک کے جیل میں لکھا تھا "بیس سال قید
کاغذ کے ایک پُرزے پر لکھے ہوئے چند الفاظ کی بنا پر ہو سکتا ہے کہ میں بیس سال
تک سورج کی شکل نہ دیکھ سکوں لیکن کیا تمہارا یہ فرسودہ نظام جو لمحہ بہ لمحہ بجلی کی سی
تیزی کے ساتھ اپنی موت کی طرف بڑھ رہا ہے، بیس سال تک زندہ رہ سکے گا"

خبر نہیں کہ بلاخانۂ سلاسل میں          تری حیاتِ ستم آشنا پہ کیا گزری
خبر نہیں کہ نگارِ سحر کی حسرت میں          تمام رات چراغِ وفا پہ کیا گزری ؟

مگر وہ دیکھ فضا میں غبار سا اُٹھا
وہ تیرے سُرخ جوانوں کے راہوار آئے
نظر اٹھا کہ وہ تیرے وطن کے محنت کش
گلے سے کہنہ غلامی کا طوق اتار آئے

اُفق پہ صبحِ بہاراں کی آمد آمد ہے          فضا میں سُرخ پھریروں کے پھول کھِلتے ہیں
زمین خندہ بلب ہے شفیق ماں کی طرح          کہ اس کی گود میں بچھڑے رفیق ملتے ہیں

شکستِ محبس و زنداں کا وقت آپہنچا
وہ تیرے خواب حقیقت میں ڈھال آئے ہیں
نظر اُٹھا کہ ترے دیس کی فضاؤں پر
نئی بہار نئی جنتوں کے سائے میں
بہت سنبھال کے لائے تھے شاطرانِ کہن
دریدہ تن ہے وہ قحبائے سیم و زر جس کو
کہ جشنِ نصرتِ محنت ہے جشنِ نصرتِ فن
رباب چھیڑ غزل خواں ہو رقص فرما ہو
میں تجھ سے دور سہی لیکن اے رفیق مرے
تری وفا کو مری جہدِ مستقل کا سلام
ترے وطن کو تری ارضِ باحمیت کو
دھڑکتے کھولتے ہندوستاں کے دل کا سلام

# ڈھونڈ رہی ہے حیات

مرے جہاں میں سمن زار ڈھونڈنے والے
یہاں بہار نہیں آتشیں بگولے ہیں
دھنک کے رنگ نہیں سرمئی فضاؤں میں
اُفق سے تا بہ اُفق پھانسیوں کے جھولے ہیں
پھر ایک منزلِ خونبار کی طرف ہیں رواں
وہ رہنما جو کئی بار راہ بھولے ہیں

بلند دعویٰ جمہوریت کے پردے ہیں
فروغِ مجلس و زنداں ہیں تازیانے ہیں
بنامِ امن ہیں جنگ و جدل کے منصوبے
بہ شورِ عدل، تفاوت کے کارخانے ہیں
دلوں پہ خوف کے پہرے لبوں پہ قفلِ سکوت
سروں پہ گرم سلاخوں کے شامیانے ہیں

مگر مٹے ہیں کہیں جبر اور تشدّد مٹے
وہ فلسفے کہ جلا دے گئے دماغوں کو
کوئی سپاہِ ستم پیشہ چُور کر نہ سکی
بَشر کی جاگی ہوئی رُوح کے ایاغوں کو
قدم قدم پہ لہو نذر دے رہی ہے حیات
سپاہیوں سے اُلجھتے ہوئے چراغوں کو

رواں ہے قافلۂ ارتقائے انسانی
نظامِ آتش و آہن کا دِل ہلائے ہوئے
بغاوتوں کے دہل بج رہے ہیں چار طرف
نکل رہے ہیں جواں مشعلیں جلائے ہوئے
تمام ارضِ جہاں کھولتا سمندر ہے
تمام کوہ و بیاباں ہیں تلملائے ہوئے

مری صدا کو دبانا تو خیر ممکن ہے
مگر حیات کی للکار، کون روکے گا؟
فصیلِ آتش و آہن بہت بلند سہی
بدلتے وقت کی رفتار کون روکے گا؟
نئے خیال کی پرواز روکنے والو
نئے عوام کی تلوار کون روکے گا؟

پناہ لینا ہے جن مجلسوں میں تیرہ نظام
وہیں سے صبح کے لشکر نکلنے والے ہیں
اُبھر رہے ہیں فضاؤں میں احمریں پرچم
کنارے مشرق و مغرب کے ملنے والے ہیں
ہزار برق گرے، لاکھ آندھیاں اٹھیں
وہ پھول کھل کے رہیں گے جو کھِلنے والے ہیں

○

جب کبھی اُن کی توجہ میں کمی پائی گئی
از سرِ نو داستانِ شوق دُہرائی گئی

ہل گئے جب تیرے لب پھر تجھ کو کیا شکوہ اگر
زندگانی بادہ و ساغر سے بہلائی گئی

اے غمِ دنیا! تجھے کیا علم تیرے واسطے
کن بہانوں سے طبیعت راہ پر لائی گئی

ہم کریں ترکِ وفا اچھا چلو یُوں ہی سہی
اور اگر ترکِ وفا سے بھی نہ رُسوائی گئی

کیسے کیسے چشم و عارض گردِ غم سے بجھ گئے
کیسے کیسے پیکروں کی شانِ زیبائی گئی

دل کی دھڑکن میں توازن آ چلا ہے خیر ہو
میری نظریں بجھ گئیں یا تیری رعنائی گئی

اُن کا غم، اُن کا تصوّر، ان کے شکوے اب کہاں
اب تو یہ باتیں بھی اے دل ہو گئیں آئی گئی

جرأت انساں پہ گو تادیب کے پہرے رہے
فطرتِ انساں کو کب زنجیر پہنائی گئی

عرصۂ ہستی میں اب تیشہ زنوں کا دور ہے
رسمِ چنگیزی اُٹھی، توقیرِ دارائی گئی!

# آوازِ آدم

دبے گی کب تلک آوازِ آدم ہم بھی دیکھیں گے
رکیں گے کب تلک جذبات برہم ہم بھی دیکھیں گے
چلو یونہی سہی یہ جورِ پیہم ہم بھی دیکھیں گے

درِ زنداں سے دیکھیں یا عروجِ دار سے دیکھیں
تمھیں رسوا سرِ بازارِ عالم ہم بھی دیکھیں گے
ذرا دم لو مآلِ شوکتِ جم، ہم بھی دیکھیں گے

بہ زعمِ قوّتِ فولاد و آہن دیکھ لو تم بھی
بہ فیضِ جذبۂ ایمان محکم، ہم بھی دیکھیں گے
جبینِ کج کلاہی خاک پُرخم، ہم بھی دیکھیں گے

مکافاتِ عمل، تاریخ انساں کی روایت ہے
کرو گے کب تلک ناوک فراہم، ہم بھی دیکھیں گے
کہاں تک ہے تمہارے ظلم میں دم ہم بھی دیکھیں گے

یہ ہنگام وداع شب ہے، اے ظلمت کے فرزندو
سحر کے دوش پر گلنار پرچم ہم بھی دیکھیں گے
تمہیں بھی دیکھنا ہوگا یہ عالم ہم بھی دیکھیں گے

# متاعِ غیر

میرے خوابوں کے جھروکوں کو سجانے والی
تیرے خوابوں میں کہیں میرا گزر ہے کہ نہیں
پوچھ کر اپنی نگاہوں سے بتا دے مجھ کو
میری راتوں کے مقدّر میں سحر ہے کہ نہیں

چار دن کی یہ رفاقت جو رفاقت بھی نہیں
عمر بھر کے لیے آزار ہوئی جاتی ہے
زندگی یوں تو ہمیشہ سے پریشان سی تھی
اب تو ہر سانس گراں بار ہوئی جاتی ہے

میری اُجڑی ہوئی نیندوں کے شبستانوں میں
تو کسی خواب کے پیکر کی طرح آئی ہے
کبھی اپنی سی، کبھی غیر نظر آتی ہے
کبھی اخلاص کی مورت، کبھی ہرجائی ہے

پیار پر بس تو نہیں ہے مرا، لیکن پھر بھی
تُو بتا دے کہ تجھے پیار کروں یا نہ کروں
تُو نے خود اپنے تبسّم سے جگایا ہے جنہیں
ان تمنّاؤں کا اظہار کروں یا نہ کروں

تو کسی اور کے دامن کی کلی ہے، لیکن
میری راتیں تری خوشبو سے بسی رہتی ہیں
تو کہیں بھی ہو ترے پھول سے عارض کی قسم
تیری پلکیں مری آنکھوں پہ جھکی رہتی ہیں

تیرے ہاتھوں کی حرارت، ترے سانسوں کی مہک
تیرتی رہتی ہے احساس کی پہنائی میں
ڈھونڈتی رہتی ہیں تخئیل کی بانہیں تجھ کو
سرد راتوں کی سلگتی ہوئی تنہائی میں

تیرا اندازِ کرم ایک حقیقت ہے مگر
یہ حقیقت بھی، حقیقت میں فسانہ ہی نہ ہو
تیری مانوس نگاہوں کا یہ محتاط پیام
دل کے خوں کرنے کا ایک اور بہانہ ہی نہ ہو

کون جانے مرے امروز کا فردا کیا ہے
قربتیں بڑھ کے پشیمان بھی ہو جاتی ہیں
دل کے دامن سے لپٹتی ہوئی رنگیں نظریں
دیکھتے دیکھتے انجان بھی ہو جاتی ہیں

میری درماندہ جوانی کی تمنّاؤں کے
مضمحل خواب کی تعبیر بتا دے مجھ کو
تیرے دامن میں گلستاں بھی ہیں ویرانے بھی
میرا حاصل مری تقدیر بتا دے مجھ کو

# بشرطِ استواری

خونِ جمہور میں بھیگے ہوئے پرچم لے کر
مجھ سے افراد کی شاہی نے وفا مانگی ہے
صبح کے نور پہ تعزیر لگانے کے لیے
شب کی سنگین سیاہی نے وفا مانگی ہے
اور یہ چاہا ہے کہ میں قافلۂ آدم کو
ٹوکنے والی نگاہوں کا مددگار بنوں!
جس تصوّر سے چراغاں ہے سرِ جادۂ زیست
اس تصوّر کی ہزیمت کا گنہگار بنوں!

ظلم پروردہ قوانین کے ایوانوں سے
بیڑیاں تکتی ہیں زنجیر صدا دیتی ہے
طاقِ تادیب سے انصاف کے بُت گھورتے ہیں
مسندِ عدل سے شمشیر صدا دیتی ہے
لیکن اے عظمتِ انساں کے سنہرے خوابو
میں کسی تاج کی سطوت کا پرستار نہیں
میرے افکار کا عنوانِ ارادت تم ہو
میں تمہارا ہوں لٹیروں کا وفادار نہیں

○

ہر قدم مرحلۂ دار و صلیب آج بھی ہے
جو کبھی تھا وہی انساں کا نصیب آج بھی ہے

جگمگاتے ہیں افق پر یہ ستارے لیکن
راستہ منزلِ ہستی کا مہیب آج بھی ہے

سرِ مقتل جنہیں جانا تھا وہ جا بھی پہنچے
سرِ منبر کوئی محتاط خطیب آج بھی ہے

اہلِ دانش نے جسے امرِ مسلّم مانا
اہلِ دل کے لئے وہ بات عجیب آج بھی ہے

یہ تری یاد ہے یا میری اذیت کوشی
ایک نشتر سا رگِ جاں کے قریب آج بھی ہے

کون جانے یہ ترا شاعرِ آشفتہ مزاج
کتنے مغرور خداؤں کا رقیب آج بھی ہے

# انتظار

چاند مدھم ہے آسماں چُپ ہے
نیند کی گود میں جہاں چُپ ہے

دُور وادی میں دودھیا بادل
جھک کے پربت کو پیار کرتے ہیں
دل میں ناکام حسرتیں لے کر
ہم ترا انتظار کرتے ہیں

ان بہاروں کے سائے میں آ جا
پھر محبت جواں رہے نہ رہے
زندگی تیرے نامرادوں پر!
کل تلک مہرباں رہے نہ رہے

روز کی طرح آج بھی تارے
صبح کی گرد میں نہ کھو جائیں
آ ترے غم میں جاگتی آنکھیں
کم سے کم ایک رات سو جائیں

چاند مدھم ہے آسماں چُپ ہے
نیند کی گود میں جہاں چُپ ہے

# تیری آواز

رات سنسان تھی بوجھل تھیں فضا کی سانسیں
روح پر چھائے تھے بے نام غموں کے سائے
دل کو یہ ضد تھی کہ تو آئے تسلّی دینے
میری کوشش تھی کہ کمبخت کو نیند آ جائے

دیر تک آنکھوں میں چبھتی رہی تاروں کی چمک
دیر تک ذہن سُلگتا رہا تنہائی میں
اپنے ٹھکرائے ہوئے دوست کی پرسش کیلئے
تو نہ آئی مگر اس رات کی پہنائی میں

یُوں اچانک تری آواز کہیں سے آئی
جیسے پربت کا جگر چیر کے جھرنا پھوٹے
یا زمینوں کی محبّت میں تڑپ کر ناگاہ
آسمانوں سے کوئی شوخ ستارہ ٹوٹے

شہد سا گھُل گیا تلخابۂ تنہائی میں
رنگ سا پھیل گیا دل کے سیہ خانے میں
دیر تک یُوں تری مستانہ صدائیں گونجیں
جسطرح پھول چٹکنے لگیں ویرانے میں

تو بہت دُور کسی انجمنِ ناز میں تھی
پھر بھی محسوس کیا میں نے کہ تو آئی ہے
اور نغموں میں چھپا کر مرے کھوئے ہوئے خواب
میری روٹھی ہوئی نیندوں کو منا لائی ہے

رات کی سطح پر اُبھرے ترے چہرے کے نقوش
وہی چُپ چاپ سی آنکھیں وہی سادہ سی نظر
وہی ڈھلکا ہوا آنچل وہی رفتار کا خم
وہی رہ رہ کے لچکتا ہوا نازک پیکر

تو مرے پاس نہ تھی پھر بھی سحر ہونے تک
تیرا ہر سانس مرے جسم کو چھو کر گزرا!
قطرہ قطرہ ترے دیدار کی شبنم ٹپکی
لمحہ لمحہ تری خوشبو سے معطّر گزرا!

اب یہی ہے تجھے منظور تو اے جانِ قرار
میں تری راہ نہ دیکھوں گا سیہ راتوں میں
ڈھونڈ لیں گی مری ترسی ہوئی نظریں تجھ کو
نغمہ و شعر کی اُمڈی ہوئی برساتوں میں

اب ترا پیار ستائے گا تو میری ہستی!
تیری مستی بھری آواز میں ڈھل جائے گی
اور یہ روح جو تیرے لیے بے چین سی ہے
گیت بن کر ترے ہونٹوں پہ مچل جائے گی

تیرے نغمات ترے حسن کی ٹھنڈک لے کر
میرے تپتے ہوئے ماحول میں آ جائیں گے
چند گھڑیوں کے لیے ہوں کہ ہمیشہ کے لیے
مری جاگی ہوئی راتوں کو سلا جائیں گے

○

بھڑکا رہے ہیں آگ لبِ نغمہ گر سے ہم
خاموش کیا رہیں گے زمانے کے ڈر سے ہم

کچھ اور بڑھ گئے جو اندھیرے تو کیا ہُوا
مایوس تو نہیں ہیں طلوعِ سحر سے ہم

لے دے کے اپنے پاس فقط اِک نظر تو ہے
کیوں دیکھیں زندگی کو کسی کی نظر سے ہم

مانا کہ اس زمیں کو نہ گلزار کر سکے
کچھ خار کم تو کر گئے گزرے جدھر سے ہم

# خوبصورت موڑ

چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں
نہ میں تم سے کوئی امید رکھوں دلنوازی کی
نہ تم میری طرف دیکھو غلط انداز نظروں سے
نہ میرے دل کی دھڑکن لڑکھڑائے میری باتوں سے
نہ ظاہر ہو تمھاری کشمکش کا راز نظروں سے

تمھیں بھی کوئی الجھن روکتی ہے پیشقدمی سے
مجھے بھی لوگ کہتے ہیں کہ یہ جلوے پرائے ہیں
مرے ہمراہ بھی رسوائیاں ہیں میرے ماضی کی
تمھارے ساتھ بھی گزری ہوئی راتوں کے سائے ہیں

تعارف روگ ہو جائے تو اس کا بھولنا بہتر
تعلق بوجھ بن جائے تو اس کو توڑنا اچھا
وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن
اُسے اِک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا

چلو اِک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

○

اس طرف سے گزرے تھے قافلے بہاروں کے
آج تک سلگتے ہیں زخم رہگزاروں کے

خلوتوں کے شیدائی خلوتوں میں کھلتے ہیں
ہم سے پوچھ کر دیکھو، راز پردہ داروں کے

گیسوؤں کی چھاؤں میں، دل نواز چہرے ہیں
یا حسیں دھندلکوں میں، پھول ہیں بہاروں کے

پہلے ہنس کے ملتے ہیں، پھر نظر چراتے ہیں
آشنا صفت ہیں لوگ، اجنبی دیاروں کے

تم نے صرف چاہا ہے ہم نے چھُو کے دیکھے ہیں
پیرہن گھٹاؤں کے، جسم برق پاروں کے

شغلِ مے پرستی گو، جشن نامرادی تھا
یوں بھی کٹ گئے کچھ دن تیرے سوگواروں کے

# مرے عہد کے حسینو

وہ ستارے جن کی خاطر کئی بے قرار صدیاں
مری تیرہ بخت دنیا میں ستارہ وار جاگیں
کبھی رفعتوں پہ لپکیں، کبھی وسعتوں سے اُلجھیں
کبھی سوگوار سوئیں، کبھی نغمہ بار جاگیں

وہ بلند بام تارے وہ فلک مقام تارے
وہ نشان دے کے اپنا رہے بے نشاں ہمیشہ
وہ حسیں، وہ نُور زادے، وہ خلا کے شاہزادے
جو ہماری قسمتوں پر رہے حکمراں ہمیشہ

جنھیں مضمحل دلوں نے ابدی پناہ جانا
تھکے ہارے قافلوں نے جنھیں خضرِ راہ جانا
جنھیں کم سِنوں نے چاہا کہ لپک کے پیار کر لیں
جنھیں مہوشوں نے مانگا کہ گلے کا ہار کر لیں
جنھیں عاشقوں نے چاہا کہ فلک سے توڑ لائیں

کسی راہ میں بچھائیں، کسی سیج پر سجائیں
جنھیں بُت گروں نے چاہا کہ صنم بنا کے پوجیں
یہ جو دُور کے حسیں ہیں انھیں پاس لا کے پوجیں
جنھیں مُطربوں نے چاہا کہ صداؤں میں پرو لیں
جنھیں شاعروں نے چاہا کہ خیال میں سمو لیں

جو ہزار کوششوں پر بھی شُمار میں نہ آئے
کبھی خاکِ بے بضاعت کے دیار میں نہ آئے
جو ہماری دسترس سے رہے دُور دُور اب تک
ہمیں دیکھتے رہے ہیں جو بصد غرور اب تک

مرے عہد کے حسینو! وہ نظر نواز تارے
مرا دَورِ عشق پرور تمھیں نذر دے رہا ہے
وہ جنوں جو آب و آتش کو اسیر کر چکا تھا!
وہ خلا کی وسعتوں سے بھی خراج لے رہا ہے

مرے ساتھ رہنے والو! مرے بعد آنے والو
میرے دَور کا یہ تحفہ تمھیں سازگار آئے
کبھی تم خلا سے گزرو کسی سیم تن کی خاطر
کبھی تم کو دل میں رکھ کر کوئی گلعذار آئے

# یہ کس کا لہو ہے

(جہازیوں کی بغاوت ۱۹۴۶ء)

اے رہبرِ ملک و قوم ذرا
آنکھیں تو اُٹھا نظریں تو ملا
کچھ ہم بھی سنیں، ہم کو بھی بتا
یہ کس کا لہو ہے کون مرا

دھرتی کی سلگتی چھاتی کے بے چین شرارے پوچھتے ہیں
تم لوگ جنہیں اپنا نہ سکے وہ خون کے دھارے پوچھتے ہیں
سڑکوں کی زباں چلاتی ہے، ساگر کے کنارے پوچھتے ہیں
یہ کس کا لہو ہے کون مرا
اے رہبرِ ملک و قوم بتا!
یہ کس کا لہو ہے کون مرا

وہ کون سا جذبہ تھا جس سے فرسودہ نظامِ زیست ملا
جُھلسے ہوئے ویراں گلشن میں اک آس امید کا پھول کھلا
جنتا کا لہو فوجوں سے ملا، فوجوں کا خوں جنتا سے ملا

اے رہبرِ ملک و قوم بتا
یہ کس کا لہو ہے کون مرا
اے رہبر ملک و قوم بتا

کیا قوم وطن کی جے گا کر مرتے ہوئے راہی غنڈے تھے
جو دیس کا پرچم لے کے اُٹھے وہ شوخ سپاہی غنڈے تھے
جو بارِ غلامی سہہ نہ سکے، وہ مجرمِ شاہی غنڈے تھے

یہ کس کا لہُو ہے کون مرا
اے رہبرِ ملک و قوم بتا!
یہ کس کا لہُو ہے کون مرا

اے عزمِ فنا دینے والو! پیغامِ بقا دینے والو!
اب آگ سے کیوں کتراتے ہو؟ شعلوں کو ہوا دینے والو!
طوفان سے اب ڈرتے کیوں ہو؟ موجوں کو صدا دینے والو!

کیا بھول گئے اپنا نعرہ
اے رہبرِ ملک و قوم بتا!
یہ کس کا لہُو ہے کون مرا

سمجھوتے کی اُمید سہی، سرکار کے وعدے ٹھیک سہی
ہاں مشقِ ستم افسانہ سہی، ہاں پیار کے وعدے ٹھیک سہی
اپنوں کے کلیجے مت چھیدو اغیار کے وعدے ٹھیک سہی
جمہُور سے یوں دامن نہ چھڑا
اے رہبرِ ملک و قوم بتا
یہ کس کا لہو ہے کون مرا
ہم ٹھان چکے ہیں اب جی میں ہر ظالم سے ٹکرائیں گے
تم سمجھوتے کی آس رکھو، ہم آگے بڑھتے جائیں گے
ہر منزلِ آزادی کی قسم، ہر منزل پہ دہرائیں گے
یہ کِس کا لہُو ہے کون مرا
اے رہبرِ ملک و قوم بتا!
یہ کِس کا لہُو ہے کون مرا!

پھر نہ کیجئے مری گستاخ نگاہی کا گلہ
دیکھیے آپ نے پھر پیار سے دیکھا مجھ کو

# پرچھائیاں

(ایک طویل نظم)

"پرچھائیاں" میری پہلی طویل نظم ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں امن اور تہذیب کے تحفظ کے لیے جو تحریک چل رہی ہے، یہ نظم اس کا ایک حصہ ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہر نوجوان نسل کو یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ اُسے جو دنیا اپنے بزرگوں سے ورثہ میں ملی ہے۔ وہ آئندہ نسلوں کو اس سے بہتر اور خوبصورت دنیا دے کر جائے میری یہ نظم اس کوشش کا ادبی روپ ہے۔

ساحر لدھیانوی

# دیباچہ

ایک اچھی نظم کی خصوصیات وہی ہیں جنہیں غالب نے حسن کی کیفیت بیان کرنے کے لیے چار لفظوں میں ادا کیا ہے "سادگی و پرکاری، بےخودی و ہوشیاری" ان چاروں کیفیات کا امتزاج مشکل ہے۔ لیکن جب یہ مشکل آسان ہو جاتی ہے تو نظم ایک مکمل پیکرِ حسن بن کر سامنے آتی ہے اور دلوں کو موہ لیتی ہے۔

ساحر نے ایک سادہ سی کہانی کو جو بارہا ہم نے سنی ہے اور دیکھی ہے اور محسوس کی ہے اور نظر انداز کی ہے۔ اپنی رنگین بیانی اور آتش بیانی سے پُر کیف بنا دیا ہے۔ اس کی سادگی اس کے موضوع اور مواد میں ہے اور پرکاری اس تکنیک میں جو شاعر نے استعمال کی ہے بیخودی اس مکمل ہم آہنگی سے پیدا ہوئی ہے جو شاعر کو اپنے موضوع سے ہے اور اس بیخودی کے عالم میں بھی اس کے سماجی شعور نے اسے ہوشیار رکھا ہے۔ اگر یہ ہوشیاری نہ ہوتی تو رنگین بیانی میں آتش بیانی کی آمیزش نہ ہو سکتی اور نظم کا آخری حصہ نہ لکھا جاتا۔

"پرچھائیاں" ساحر کی بیشتر نظموں کی طرح محاکات کا ایک اچھا نمونہ ہے اور بیک وقت غنائی اور بیانیہ کیفیات کی حامل ہے۔ وہ غنائی کیفیت جو بیانیہ عناصر سے آنکھ چراتی ہے بسا اوقات ذاتی داخلیت کے نہاں خانوں میں جلوے دکھا کر رہ جاتی ہے اور وہ بیانیہ کیفیت جو غنائی عناصر سے گریز کرتی ہے۔ ایک طرح کی ظاہر نگاری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جس کی مثال "نہر پہ چل رہی ہے پن چکی" سے بہتر نہیں ملتی۔ ساحر کی یہ نظم اس کی پوری

شاعری کی طرح ان دونوں عیوب سے پاک ہے۔

اس محاکاتی کیفیت کو پیدا کرنے کے لیے ساحر نے لفظوں کے استعمال میں بھی بڑی خوش مذاقی دکھائی ہے۔ اس نے بعض مقامات پر نقاشی اور رنگ کا کام لیا ہے اور وہاں اس کا قلم شاعر کے قلم کے بجائے مصوّر کا موقلم بن گیا ہے۔ الفاظ جو چند حروف کی اجتماعی شکلیں ہیں پگھل کر رنگ اور خطوط میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور کاغذ کے صفحہ پر ایک منظر کھینچ دیتے ہیں۔ ان کی صوتی کیفیت میں ٹکراؤ اور جھنکار کی بجائے ایک خاموش اور بے آواز روانی ہے۔ جیسے صاف اور چکنی سطح پر آہستہ آہستہ پانی بہہ رہا ہو۔

میں نے "پرچھائیاں" پڑھنے سے پہلے اس نظم کو مختلف جلسوں اور مشاعروں میں ساحر کی زبان سے کئی بار سُنا ہے اور یہ محسوس کیا ہے کہ اس کی اثر آفرینی کسی ایک طبقے یا گروہ تک محدود نہیں ہے۔

## اس کی دو وجہیں ہیں:-

پہلی اور بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ اس کا موضوع اس عہد کا سب سے اہم سوال ہے جس کا جواب ساری انسانیت کو دینا ہے اور "عالمی امن تحریک" اس پر شاہد ہے کہ اس کا جواب ہر ملک، ہر قوم، ہر نسل، ہر طبقے، ہر مکتبِ خیال کے آدمی نے ایک ہی طرح دیا ہے دنیا کی نصف سے زائد آبادی نے امنِ عالم کے محضر پر اپنی مہر ثبت کی ہے۔ ساحر لدھیانوی نے یہ خوبصورت نظم لکھ کر اپنے دستخط کیے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ساحر نے اپنی بات ایک کہانی کی شکل میں کہی ہے اور کہانی نظم کو زیادہ عام فہم بنا دیتی ہے۔ ہماری بعض بہترین نظمیں عام انسانوں کی سمجھ کی سطح سے بہت اونچی ہیں۔ لیکن ساحر کی نظم "پرچھائیاں" اپنی سادہ کہانی اور آسان بیانی کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ وسیع حلقوں تک پہنچ سکے گی۔ اس کے نوے فیصدی سے بھی کچھ زیادہ الفاظ ہماری روزمرّہ گفتگو کے الفاظ ہیں۔ کلاسیکیت اور روایت کے نام پر ساحر نے اپنی نظم کو اجنبی اور غیر مانوس الفاظ سے بوجھل نہیں بنایا ہے۔ ساحر کی کامیابی اس میں ہے کہ اس نے اپنے سادہ اور آسان الفاظ سے اس عہد کی بعض اہم حقیقتوں کو ایسے مصرعوں میں ڈھال دیا ہے جو زبان پر چڑھ بھی جاتے ہیں اور دل پر اثر بھی کرتے ہیں۔ مثلاً"

جب وہ یہ کہتا ہے کہ "اس دَور میں جینے کی قیمت یا دارو رسن یا خواری ہے" تو وہ ایک مصرعے میں وہ سب کچھ سمیٹ لیتا ہے جو ایک پوری کتاب کا موضوع ہے۔ یہی تاثر اور گہرائی اس شعر میں ہے ؎

بہت دنوں سے ہے یہ مشغلہ سیاست کا
کہ جب جوان ہوں بچے تو قتل ہو جائیں

اسی انداز سے اس نے اتنے بے پناہ اور اچھوتے مصرعے بھی کہے ہیں جیسے ؎

سنگین حقائق زاروں میں خوابوں کی ردائیں جلتی ہیں

اس نظم میں کہانی کہنے کی تکنیک بھی نئی ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے اس سے پہلے یہ تکنیک کسی اردو شاعر نے استعمال نہیں کی اور میں جتنا غور کرتا ہوں۔ اتنے ہی مجھے اس تکنیک کے وسیع تر امکانات نظر آتے ہیں۔ یہ تکنیک ساحر نے براہِ راست فلم سے لی ہے، جس میں وہ کئی سال سے ایک کامیاب گیت لکھنے والے شاعر کی طرح کام کر رہا ہے۔ وہ ایک طرف خوبصورت اور کامیاب گیت لکھ رہا تھا اور دوسری طرف غالباً غیر شعوری طور سے ایک نئی تکنیک کو آہستہ آہستہ پروان چڑھا رہا تھا۔ جس نے اب "پرچھائیاں" نظم کا روپ اختیار کیا ہے۔

یہ کہانی ایک پرسکون چاندنی رات کے منظر سے شروع ہوتی ہے، جس میں کہانی کا مرکزی کردار جو ایک دُکھے ہوتے دل اور لٹی ہوئی زندگی کا فنکار ہے۔ دو محبت کرنے والوں کو دیکھتا ہے اور اس طرح اس کی یادوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں
کبھی گمان کی صورت کبھی یقیں کی طرح

یہاں اس کی کھوئی ہوئی محبت کی بہت سی تصویریں یکے بعد دیگرے اس کے ذہن کے پردے پر ابھرتی ہیں اور کھوئی جاتی ہیں، ہر دو تصویروں کے بیچ ایک تخیلی جست ہے۔ جس میں پڑھنے والا شاعر کے ساتھ شریک ہو جاتا ہے۔ تصویروں کا یہ سلسلہ کامیاب محبت کے دلکش لمحوں تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اور بحر کی تبدیلی کے ساتھ ایک نئے منظر کا آغاز ہوتا ہے۔ جس

یں گرد و پیش کی زندگی، جنگ اور قحط اور افلاس کے سیلاب میں ڈوب جاتی ہے۔ جس میں مکھن سی ملائم راہیں، چرخوں کی صدائیں، چوپال کی رونقیں، پھولوں کی بالیں غارت ہو جاتی ہیں اور دفا شعار عورتوں کے پاکیزہ جسموں کی تجارت شروع ہو جاتی ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے وقت بنگال کے قحط میں یہی سب کچھ ہوا تھا۔

یہ عام زندگی کی تصویر جو ایک سیلاب کی سی کیفیت کے ساتھ ابھری تھی، ختم ہوتی ہے تو مرکزی کردار یعنی لٹے ہوئے فنکار کی محبوبہ کی دردناک تصویروں کا سلسلہ پھر شروع ہوتا ہے۔ نظم کی پہلی بحر پھر واپس آجاتی ہے اور تصورات کی پرچھائیاں بھیانک ہو کر ذہن کے پردے سے گزرنے لگتی ہیں اور اس منزل پر پہنچ کر ختم ہوتی ہیں۔ جہاں کسی کا کوئی نہیں، آج سب اکیلے ہیں۔

یہاں پھر بحر بدلتی ہے اور سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی وہ شام ابھرتی ہے۔ جہاں فنکار کی محبوبہ اپنی ساری پاکیزگی کے باوجود بک چکی ہے اور فنکار روٹی کے چند ٹکڑے حاصل کرنے کے لیے در در کی ٹھوکریں کھاتا ہے اور اپنی زندگی اور محبوبہ کی عصمت اور دونوں کے پیار کو نہیں بچا سکتا اور اس تلخ تجربے سے گزرنے کے بعد وہ اس منزل پر پہلی بار یہ محسوس کرتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ اور اس کیوں کا جواب وہ بڑی ایمانداری اور خلوص سے دیتا ہے۔

مجبور ہوں میں، مجبور ہو تم، مجبور یہ دنیا ساری ہے
اس دور میں جینے کی قیمت یا دار و رسن یا خواری ہے
میں دار و رسن تک جا نہ سکا، تم جہد کی حد تک آ نہ سکیں
ہم تم دو ایسی روحیں ہیں، جو منزلِ تسکیں پا نہ سکیں

یہاں ساحر نے بڑی فنکاری سے اس ذلیل زندگی اور اس کے نظام کو بدلنے کے لیے جہد و پیکار کا ولولہ انگیز پیام دیا ہے۔

یہیں سے ساحر کی رنگین بیانی، آتش بیانی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور نظم کا آخری حصہ شروع ہو جاتا ہے۔ جس میں لٹا ہوا فنکار نئے محبت کرنیوالوں کی نازک زندگیوں کو جنگ

قحط اور افلاس سے بچانے کا عہد کرتا ہے اور ساری دنیا کو اس منحوس جنگ کے خلاف منظم کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

ہمارا پیار حوادث کی تاب لا نہ سکا
مگر انہیں تو مرادوں کی رات مل جائے
ہمیں تو کشمکشِ مرگِ بے اماں ہی ملی
انہیں تو جھومتی گاتی حیات مل جائے

اور اس تیسری جنگ کے خطرے کے سامنے جو ایٹمی ہتھیاروں سے لڑی جائے گی۔ اُسے نئی محبت کرنے والی روحیں ہی نہیں بلکہ اپنی تنہائیاں اور اپنے تصورات کی پرچھائیاں بھی غیر محفوظ معلوم ہوتی ہیں اور وہ پچھلی جنگوں اور آنے والی جنگ کا تقابل اس طرح کرتا ہے

گزشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گزشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں

اس طرح نظم اس ذاتی تصور کی سطح پر واپس آجاتی ہے جس سے شروع ہوئی تھی۔ نظم کا یہ خاتمہ بے حد خوبصورت اور مؤثر ہے۔ ساحر لدھیانوی نے اس نظم کے ذریعے اردو کی طویل نظموں اور امنِ عالم کے ادب میں ایک خوبصورت اضافہ کیا ہے۔

علی سردار جعفری

# پرچھائیاں

جوان رات کے سینے پہ دُودھیا آنچل
مچل رہا ہے کسی خوابِ مرمریں کی طرح
حسین پھول، حسیں پتّیاں، حسیں شاخیں
لچک رہی ہیں کسی جسمِ نازنیں کی طرح
فضا میں گھُل سے گئے ہیں اُفق کے نرم خطوط
زمیں حسیں ہے خوابوں کی سرزمیں کی طرح
تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں
کبھی گمان کی صوُرت کبھی یقیں کی طرح
وہ پیڑ جن کے تلے ہم پناہ لیتے تھے
کھڑے ہیں آج بھی ساکت کسی امیں کی طرح

انہی کے سائے میں پھر آج دو دھڑکتے دل
خموش ہونٹوں سے کچھ کہنے سننے آئے ہیں

نہ جانے کتنی کشاکش سے کتنی کاوش سے
یہ سوتے جاگتے لمحے چُرا کے لائے ہیں
یہی فضا تھی، یہی رُت، یہی زمانہ تھا
یہیں سے ہم نے محبت کی ابتدا کی تھی
دھڑکتے دل سے، لرزتی ہوئی نگاہوں سے
حضورِ غیب میں ننّھی سی التجا کی تھی
کہ آرزو کے کنول کِھل کے پھول ہو جائیں
دل و نظر کی دعائیں قبول ہو جائیں

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں
تم آ رہی ہو زمانے کی آنکھ سے بچ کر
نظر جھکائے ہوئے اور بدن چرائے ہوئے
خود اپنے قدموں کی آہٹ سے جھینپتی ڈرتی
خود اپنے سائے کی جنبش سے خوف کھائے ہوئے

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں
رواں ہے چھوٹی سی کشتی ہواؤں کے رُخ پر

ندی کے ساز پہ ملّاح گیت گاتا ہے
تمہارا جسم ہر اِک لہر کے جھکولے سے
مِری کھُلی ہوئی باہوں میں جھُول جاتا ہے

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں
میں پھُول ٹانک رہا ہُوں تمہارے جُوڑے میں
تمہاری آنکھ مسرّت سے جُھکتی جاتی ہے
نہ جانے آج میں کیا بات کہنے والا ہُوں
زبان خُشک ہے آواز رُکتی جاتی ہے

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں
مرے گلے میں تمہاری گداز باہیں ہیں
تمہارے ہونٹوں پہ میرے لبوں کے سائے ہیں
مجھے یقیں ہے کہ ہم اب کبھی نہ بچھڑیں گے
تمہیں گمان کہ ہم مِل کے بھی پرائے ہیں

تصوّرات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں
مرے پلنگ پہ بکھری ہوئی کتابوں کو
ادائے عجز و کرم سے اُٹھا رہی ہو تم
سہاگ رات جو ڈھولک پہ گائے جاتے ہیں
دبے سُروں میں وہی گیت گا رہی ہو تم

تصوّرات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں
وہ لمحے کتنے دلکش تھے وہ گھڑیاں کتنی پیاری تھیں
وہ سہرے کتنے نازک تھے وہ لڑیاں کتنی پیاری تھیں
بستی کی ہر اک شاداب گلی خوابوں کا جزیرہ تھی گویا
ہر موجِ نفس، ہر موجِ صبا، نغموں کا ذخیرہ تھی گویا

ناگاہ لہکتے کھیتوں سے ٹاپوں کی صدائیں آنے لگیں
بارُود کی بوجھل بُو لے کر پچھم سے ہوائیں آنے لگیں
تعمیر کے روشن چہرے پر تخریب کا بادل پھیل گیا
ہر گاؤں میں وحشت ناچ اُٹھی، ہر شہر میں جنگل پھیل گیا

مغرب کے مہذّب ملکوں سے کچھ خاکی وردی پوش آئے
اِٹھلاتے ہوئے مغرور آئے، لہراتے ہوئے مدہوش آئے
خاموش زمیں کے سینے میں خیموں کی طنابیں گڑنے لگیں
مکھن سی ملائم راہوں پر بوٹوں کی خراشیں پڑنے لگیں
فوجوں کے بھیانک بینڈ تلے چرخوں کی صدائیں ڈوب گئیں
جیپوں کی سلگتی دھول تلے پھولوں کی قبائیں ڈوب گئیں
انسان کی قیمت گرنے لگی اجناس کے بھاؤ چڑھنے لگے
چوپال کی رونق گھٹنے لگی، بھرتی کے دفاتر بڑھنے لگے
بستی کے سجیلے شوخ جواں بن بن کے سپاہی جانے لگے
جس راہ سے کم ہی لوٹ سکے اس راہ پہ راہی جانے لگے
اُن جانے والے دستوں میں، غیرت بھی گئی، برنائی بھی
ماؤں کے جواں بیٹے بھی گئے، بہنوں کے چہیتے بھائی بھی
بستی پہ اُداسی چھانے لگی، میلوں کی بہاریں ختم ہوئیں
آموں کی لچکتی شاخوں سے جھولوں کی قطاریں ختم ہوئیں
دھول اُڑنے لگی بازاروں میں، بھوک اُگنے لگی کھلیانوں میں
ہر چیز دکانوں سے اُٹھ کر، روپوش ہوئی تہہ خانوں میں

بدحال گھروں کی بدحالی، بڑھتے بڑھتے جنجال بنی
مہنگائی بڑھ کر کال بنی، ساری بستی کنگال بنی
چرواہیاں رستہ بھول گئیں، پنہاریاں پنگھٹ چھوڑ گئیں
کتنی ہی کنواریں ابلائیں، ماں باپ کی چوکھٹ چھوڑ گئیں
افلاس زدہ دہقانوں کے، ہل بیل بکے کھلیان بکے
جینے کی تمنّا کے ہاتھوں، جینے کے سب سامان بکے
کچھ بھی نہ رہا جب بکنے کو، جسموں کی تجارت ہونے لگی
خلوت میں بھی جو ممنوع تھی وہ جلوت میں جسارت ہونے لگی

تصوّرات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں
تم آرہی ہو سرِ شام بال بکھرائے
ہزار گونہ ملامت کا بار اٹھائے ہوئے
ہوس پرست نگاہوں کی چیرہ دستی سے
بدن کی جھینپتی عریانیاں چھپائے ہوئے

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں
میں شہر جا کے ہر اک در پہ جھانک آیا ہوں
کسی جگہ مری محنت کا مول مِل نہ سکا
ستمگروں کے سیاسی قمار خانے میں
اَلم نصیب فراست کا مول مِل نہ سکا

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں
تمہارے گھر میں قیامت کا شور برپا ہے
محاذِ جنگ سے ہرکارہ "تار" لایا ہے
کہ جس کا ذکر تمہیں زندگی سے پیارا تھا
وہ بھائی "نرغۂ دشمن" میں کام آیا ہے

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں
ہر ایک گام پہ بدنامیوں کا جمگھٹ ہے
ہر ایک موڑ پہ رُسوائیوں کے میلے ہیں
نہ دوستی، نہ تکلّف، نہ دِلبری، نہ خلوص

## کسی کا کوئی نہیں آج سب اکیلے ہیں

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں
وہ رہگذر جو مرے دل کی طرح سُونی ہے
نہ جانے تم کو کہاں لے کے جانے والی ہے
نہیں خرید رہے ہیں ضمیر کے قاتل
اُفق پہ خونِ تمنّائے دل کی لالی ہے

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں
سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی وہ شام ہے اب تک یاد مجھے
چاہت کے سنہرے خوابوں کا انجام ہے اب تک یاد مجھے

اس شام مجھے معلوم ہوا کھیتوں کی طرح اس دنیا میں
سہمی ہوئی دوشیزاؤں کی مسکان بھی بیچی جاتی ہے

اس شام مجھے معلوم ہُوا، اس کارگہِ زرداری میں
دو بھولی بھالی روحوں کی پہچان بھی بیچی جاتی ہے

اُس شام مجھے معلوم ہوا جب باپ کی کھیتی چھن جائے
ممتا کے سُنہرے خوابوں کی انمول نشانی بِکتی ہے

اُس شام مجھے معلوم ہوا جب بھائی جنگ میں کام آئیں
سرمائے کے قحبہ خانے میں بہنوں کی جوانی بِکتی ہے

سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی وہ شام ہے اب تک یاد مجھے
چاہت کے سنہرے خوابوں کا انجام ہے اب تک یاد مجھے

تم آج ہزاروں میل یہاں سے دُور کہیں تنہائی میں
یا بزم طرب آرائی میں
میرے سپنے بُنتی ہو گی بیٹھی آغوش پرائی میں
اور میں سینے میں غم لے کر دن رات مشقّت کرتا ہوں
جینے کی خاطر مرتا ہوں
اپنے فن کو رُسوا کر کے اغیار کا دامن بھرتا ہوں
مجبور ہوں میں، مجبور ہو تم، مجبور یہ دنیا ساری ہے
تن کا دکھ من پر بھاری ہے

اِس دَور میں جینے کی قیمت یا دار و رسن یا خواری ہے
میں دار و رسن تک جا نہ سکا تم جہد کی حد تک آ نہ سکیں
چاہا تو مگر اپنا نہ سکیں
ہم تو دو ایسی رُوحیں ہیں جو منزل تسکیں پا نہ سکیں
جینے کو جئے جاتے ہیں مگر، سانسوں میں چتائیں جلتی ہیں
خاموش وفائیں جلتی ہیں
سنگین حقائق زاروں میں، خوابوں کی ردائیں جلتی ہیں
اور آج جب اِن پیڑوں کے تلے پھر دو سائے لہرائے ہیں
پھر دو دل ملنے آئے ہیں
پھر موت کی آندھی اُٹھی ہے پھر جنگ کے بادل چھائے ہیں
میں سوچ رہا ہوں اِن کا بھی اپنی ہی طرح انجام نہ ہو
ان کا بھی جنوں ناکام نہ ہو
ان کے بھی مقدّر میں لکھی، اک خون میں لتھڑی شام نہ ہو
سورج کے لہو میں لتھڑی ہوئی وہ شام ہے اب تک یاد مجھے
چاہت کے سنہرے خوابوں کا انجام ہے اب تک یاد مجھے

ہمارا پیار حوادث کی تاب لا نہ سکا
مگر انہیں تو مُرادوں کی رات مِل جائے
ہمیں تو کشمکشِ مرگِ بے اماں ہی مِلی
اِنہیں تو جھُومتی گاتی حیات مِل جائے

بہت دِنوں سے ہے یہ مشغلہ سیاست کا
کہ جب جوان ہوں بچے تو قتل ہو جائیں
بہت دِنوں سے یہ ہے خبط حکمرانوں کا
کہ دُور دُور کے ملکوں میں قحط بو جائیں

بہت دِنوں سے جوانی کے خواب ویراں ہیں
بہت دِنوں سے محبّت پناہ ڈھونڈتی ہے
بہت دِنوں سے ستم دیدہ شاہراہوں میں
نگارِ زیست کی عِصمت پناہ ڈھونڈتی ہے

چلو کہ آج سبھی پائمال رُوحوں سے
کہیں کہ اپنے ہر اِک زخم کو زباں کر لیں
ہمارا راز ہمارا نہیں، سبھی کا ہے
چلو کہ سارے زمانے کو راز داں کر لیں

چلو کہ چل کے سیاسی مقامروں سے کہیں
کہ ہم کو جنگ و جدل کے چلن سے نفرت ہے
جسے لہو کے سوا کوئی رنگ راس نہ آئے
ہمیں حیات کے اُس پیرہن سے نفرت ہے
کہو کہ اب کوئی قاتل اگر اِدھر آیا
تو ہر قدم یہ زمیں تنگ ہوتی جائے گی
ہر ایک موجِ ہوا رُخ بدل کے جھپٹے گی
ہر ایک شاخ رگِ سنگ ہوتی جائے گی
اُٹھو کہ آج ہر اک جنگ جُو سے یہ کہہ دیں
کہ ہم کو کام کی خاطر کلوں کی حاجت ہے
ہمیں کسی کی زمیں چھیننے کا شوق نہیں
ہمیں تو اپنی زمیں پر ہلوں کی حاجت ہے
کہو کہ اب کوئی تاجر اِدھر کا رُخ نہ کرے
اب اس جگہ کوئی کنواری نہ بیچی جائے گی
یہ کھیت جاگ پڑے، اُٹھ کھڑی ہوئیں فصلیں
اب اس جگہ کوئی کیاری نہ بیچی جائے گی

یہ سرزمین ہے گوتم کی اور نانک کی
اِس ارضِ پاک پہ وحشی نہ چل سکیں گے کبھی
ہمارا خون امانت ہے نسلِ نو کے لیے
ہمارے خون پہ لشکر نہ پل سکیں گے کبھی
کہو کہ آج بھی ہم سب اگر خموش رہے
تو اس دمکتے ہوئے خاکداں کی خیر نہیں
جنوں کی ڈھالی ہوئی ایٹمی بلاؤں سے
زمیں کی خیر نہیں، آسماں کی خیر نہیں
گذشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اِس بار
عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گذشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اِس بار
عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں
تصوّرات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں

# آؤ کہ کوئی خواب بُنیں

مجھے معلوم ہے انجامِ رُوداِدِ محبّت کا
مگر، کچھ اور تھوڑی دیر سعیِ رائیگاں کر لُوں!

خوابوں کے آسرے پہ کٹی ہے تمام عمر

ساحرؔ

# فہرست


| | | | |
|---|---|---|---|
| قطعہ | ۱۸۷ | صدیوں سے | ۲۲۶ |
| قطعہ | ۱۸۸ | اے نئی نسل | ۲۲۸ |
| آؤ کہ کوئی خواب بُنیں | ۱۸۹ | نے میں کچھ نہیں | ۲۳۲ |
| بہت گھٹن ہے | ۱۹۱ | دل ابھی .....! | ۲۳۳ |
| قطعات | ۱۹۶ | یہ زمین جس قدر.....! | ۲۳۵ |
| اب آئیں یا نہ آئیں | ۱۹۷ | بڑی طاقتیں | ۲۳۷ |
| ایک ملاقات | ۱۹۸ | لشکر کشی | ۲۳۸ |
| خون پھر خون ہے | ۲۰۰ | .....مگر ظلم کے خلاف | ۲۳۹ |
| ہم عصر | ۲۰۳ | توڑ لیں گے ہر اک شے سے رشتہ | ۲۴۱ |
| لب پہ پابندی تو ہے | ۲۰۵ | بات کریں | ۲۴۳ |
| جواہر لال نہرو | ۲۰۷ | پیار کا تحفہ | ۲۴۴ |
| اے شریف انسانو! | ۲۱۰ | میں پل دو پل کا شاعر ہوں | ۲۴۶ |
| کیوں ہو؟ | ۲۱۴ | گو مسلکِ تسلیم و رضا | ۲۴۸ |
| اہلِ دل اور بھی ہیں | ۲۱۵ | جو لطفِ مے کشی ہے | ۲۴۹ |
| ۲۶ جنوری | ۲۱۶ | ورثہ | ۲۵۱ |
| میں زندہ ہوں | ۲۱۸ | گلشن گلشن پھول | ۲۵۶ |
| جشنِ غالب | ۲۱۹ | نادار تک نہیں پہنچا | ۲۵۷ |
| گاندھی ہو یا غالب ہو | ۲۲۱ | آج کا پیار تھوڑا بچا کر رکھو | ۲۵۹ |
| دیکھا ہے زندگی کو | ۲۲۳ | آخری برائی | |
| لینن | ۲۲۴ | | |

○

وجہِ بے رنگیٔ گلزار کہوں تو کیا ہو
کون ہے کتنا گنہگار کہوں تو کیا ہو
تم نے جو بات سرِ بزم نہ سننا چاہی
میں وہی بات سرِ دار کہوں تو کیا ہو

نہ مُنہ چھپا کے جئے ہم، نہ سر جھکا کے جئے
ستمگروں کی نظر سے نظر مِلا کے جئے
اب ایک رات، اگر کم جئے، تو کم ہی سہی
یہی بہت ہے کہ ہم مشعلیں جلا کے جئے

# آؤ کہ کوئی خواب بُنیں

آؤ کہ کوئی خواب بُنیں، کل کے واسطے
ورنہ یہ رات، آج کے سنگین دَور کی
ڈس لے گی جان و دل کو کچھ ایسے کہ جان و دل
تا عمر پھر نہ کوئی حسیں خواب بُن سکیں

گو ہم سے بھاگتی رہی یہ تیز گام عُمر
خوابوں کے آسرے پہ کٹی ہے تمام عُمر

زُلفوں کے خواب، ہونٹوں کے خواب اور بدن کے خواب
معراجِ فن کے خواب، کمالِ سخن کے خواب
تہذیبِ زندگی کے، فروغِ وطن کے خواب
زنداں کے خواب، کوچۂ دار و رسن کے خواب

یہ خواب ہی تو اپنی جوانی کے پاس تھے
یہ خواب ہی تو اپنے عمل کی اساس تھے
یہ خواب، مر گئے ہیں تو بے رنگ ہے حیات
یوں ہے کہ جیسے دستِ تہہ سنگ ہے حیات

آؤ کہ کوئی خواب بنیں، کل کے واسطے
ورنہ یہ رات آج کے سنگین دَور کی
ڈس لے گی جان و دل کو کچھ ایسے کہ جان و دل
تا عُمر پھر نہ کوئی حسیں خواب بُن سکیں

# بہت گھٹن ہے

بہت گھٹن ہے کوئی صورتِ بیاں نکلے
اگر صدا نہ اُٹھے، کم سے کم فغاں نکلے

فقیرِ شہر کے تن پر لباس باقی ہے
امیرِ شہر کے ارماں ابھی کہاں نکلے

حقیقتیں ہیں سلامت تو خواب بہتیرے
اُداس کیوں ہو جو کچھ خواب رائیگاں نکلے

وہ فلسفے جو ہر اک آستاں کے دشمن تھے
عمل میں آئے تو خود وقفِ آستاں نکلے

اِدھر بھی خاک اُڑی ہے اُدھر بھی زخم پڑے
جدھر سے ہو کے بہاروں کے کارواں نکلے

سِتم کے دَور میں ہم اہلِ دل ہی کام آئے
زباں پہ ناز تھا جن کو وہ بے زباں نکلے

# قطعات

جہاں جہاں تری نظروں کی اوس ٹپکی تھی
وہاں وہاں سے ابھی تک غبار اُٹھتا ہے
جہاں جہاں ترے جلووں کے پھُول بکھرے تھے
وہاں وہاں دلِ وحشی پکار اُٹھتا ہے

○

تپتے دِل پر یوں گرتی ہے
تیری نظر سے پیار کی شبنم
جلتے ہوئے جنگل پر جیسے
برکھا برسے، رُک رُک، تھم تھم

○

کس کو خبر تھی، کس کو یقیں تھا ایسے بھی دن آئیں گے
جینا بھی مشکل ہو گا، اور مرنے بھی نہ پائیں گے
ہم جیسے برباد دلوں کا جینا کیا اور مرنا کیا
آج تری محفل سے اُٹھے کل دُنیا سے اُٹھ جائیں گے

ہوش میں تھوڑی بے ہوشی ہے
بے ہوشی میں ہوش ہے کم
تجھ کو پانے کی کوشش میں
دونوں جہاں سے کھو گئے ہم

# اب آئیں یا نہ آئیں

اب آئیں یا نہ آئیں اِدھر پوچھتے چلو
کیا چاہتی ہے اُن کی نظر پوچھتے چلو

ہم سے اگر ہے ترکِ تعلق، تو کیا ہُوا
یارو! کوئی تو ان کی خبر پوچھتے چلو

جو خود کو کہہ رہے ہیں کہ منزل شناس ہیں
ان کو بھی کیا خبر ہے، مگر پوچھتے چلو

کس منزلِ مراد کی جانب رواں ہیں ہم
اے رہروانِ خاک بسر پوچھتے چلو

# ایک ملاقات

تری تڑپ سے نہ تڑپا تھا میرا دل، لیکن
ترے سکون سے بے چین ہو گیا ہوں میں
یہ جان کر تجھے کیا جانے، کتنا غم پہنچے
کہ آج تیرے خیالوں میں کھو گیا ہوں میں

کسی کی ہو کے تو اس طرح میرے گھر آئی
کہ جیسے پھر کبھی آئے تو گھر ملے نہ ملے
نظر اٹھائی، مگر ایسی بے یقینی سے
کہ جس طرح کوئی پیشِ نظر ملے نہ ملے

تُو مسکرائی، مگر مسکرا کے رُک سی گئی
کہ مسکرانے سے غم کی خبر ملے نہ ملے
رُکی تو ایسے کہ جیسے تری ریاضت کو
اب اِس ثمر سے زیادہ ثمر مِلے نہ مِلے
گئی تو سوگ میں ڈوبے قدم یہ کہہ کے گئے
سفر ہے شرط، شریکِ سفر مِلے نہ مِلے

تری تڑپ سے نہ تڑپا تھا میرا دل، لیکن
ترے سکون سے بے چین ہو گیا ہوں میں
یہ جان کر تجھے کیا جانے، کتنا غم پہنچے
کہ آج تیرے خیالوں میں کھو گیا ہوں میں

# خون پھر خون ہے

. . . ایک مقتول لومبا، ایک زندہ لومبا سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتا ہے

جواہر لال نہرو

ظُلم پھر ظُلم ہے، بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا

خاکِ صحرا پہ جمے یا کفِ قاتل پہ جمے
فرقِ انصاف پہ یا پائے سلاسل پہ جمے
تیغِ بیداد پہ، یا لاشہ بسمل پہ جمے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا

لاکھ بیٹھے کوئی چھپ چھپ کے کمیں گاہوں میں
خون خود دیتا ہے جلاّدوں کے مسکن کا سراغ
سازشیں لاکھ اڑھاتی رہیں ظلمت کی نقاب
لے کے ہر بُوند نکلتی ہے ہتھیلی پہ چراغ

ظلم کی قسمتِ ناکارہ و رُسوا سے کہو
جبر کی حکمتِ پرکار کے ایما سے کہو
محملِ مجلس اقوام کی لیلیٰ سے کہو
خون دیوانہ ہے دامن پہ لپک سکتا ہے
شعلۂ تُند ہے، خرمن پہ لپک سکتا ہے

تم نے جس خون کو مقتل میں دبانا چاہا
آج وہ کوچہ و بازار میں آ نکلا ہے
کہیں شعلہ، کہیں نعرہ، کہیں پتھّر بن کر
خون چلتا ہے تو رکتا نہیں سنگینوں سے
سر اٹھاتا ہے تو دبتا نہیں آئینوں سے

ظلم کی بات ہی کیا، ظلم کی اوقات ہی کیا
ظلم بس ظلم ہے آغاز سے انجام تلک
خون پھر خون ہے، سَو شکل بدل سکتا ہے
ایسی شکلیں کہ مٹاؤ تو مٹائے نہ بنے
ایسے شعلے کہ بجھاؤ تو بجھائے نہ بنے
ایسے نعرے کہ دباؤ تو دبائے نہ بنے

# ہم عصر

تُو بھی کچھ پریشاں ہے
تُو بھی سوچتی ہو گی
تیرے نام کی شہرت، تیرے کام کیا آئی
میں بھی کچھ پشیماں ہوں
میں بھی غور کرتا ہوں
میرے کام کی عظمت، میرے کام کیا آئی
تیرے خواب بھی سُونے
میرے خواب بھی سُونے
تیری میری شہرت سے
تیرے میرے غم دُونے

تو بھی اِک سُلگتا بن
میں بھی اِک سُلگتا بن
تیری قبر تیرا فن
میری قبر میرا فن

اب تجھے میں کیا دُوں گا
اب مجھے تو کیا دے گی
تیری میری غفلت کو
زندگی سزا دے گی

تُو بھی کچھ پریشاں ہے
تُو بھی سوچتی ہو گی
تیرے نام کی شہرت ، تیرے کام کیا آئی

میں بھی کچھ پشیماں ہُوں
میں بھی غور کرتا ہُوں
میرے کام کی عظمت ، میرے کام کیا آئی

# لب پہ پابندی تو ہے

لب پہ پابندی تو ہے، احساس پر پہرا تو ہے
پھر بھی اہلِ دل کو احوالِ بشر کہنا تو ہے

خونِ اعدا سے نہ ہو، خونِ شہیداں ہی سے ہو
کچھ نہ کچھ اس دور میں رنگِ چمن نکھرا تو ہے

اپنی غیرت بیچ ڈالیں، اپنا مسلک چھوڑ دیں
رہنماؤں میں بھی کچھ لوگوں کا یہ منشا تو ہے

ہے جنہیں سب سے زیادہ دعویٰ حب الوطن
آج اُن کی وجہ سے حُبِّ وطن رُسوا تو ہے

بجھ رہے ہیں ایک اِک کرکے عقیدوں کے دیئے
اس اندھیرے کا بھی لیکن سامنا کرنا تو ہے

جھُوٹ کیوں بولیں فروغِ مصلحت کے نام پر
زندگی پیاری سہی، لیکن ہمیں مرنا تو ہے

# جواہر لال نہرو

جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے
جسم مٹ جانے سے انسان نہیں مر جاتے

دھڑکنیں رُکنے سے ارمان نہیں مر جاتے
سانس تھم جانے سے اعلان نہیں مر جاتے

ہونٹ جم جانے سے فرمان نہیں مر جاتے
جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے

وہ جو ہر دین سے مُنکر تھا ہر اک دھرم سے دور
پھر بھی ہر دین، ہر اک دھرم کا غمخوار رہا

ساری قوموں کے گناہوں کا کڑا بوجھ لئے
عمر بھر صورتِ عیسیٰ جو سِرِدار رہا

جس نے انسانوں کی تقسیم کے صدمے جھیلے
پھر بھی انساں کی اخوت کا پرستار رہا

جس کی نظروں میں تھا اِک عالمی تہذیب کا خواب
جس کا ہر سانس نئے عہد کا معمار رہا

جس نے زردار معیشت کو گوارا نہ کیا
جس کو آئینِ مساوات پہ اصرار رہا

اُس کے فرمانوں کی، اعلانوں کی تعظیم کرو
راکھ تقسیم کی، ارمان بھی تقسیم کرو

موت اور زیست کے سنگم پہ پریشاں کیوں ہو
اس کا بخشا ہوا سہ رنگ علم لے کے چلو

جو تمہیں جادۂ منزل کا پتہ دینا ہے
اپنی پیشانی پہ وہ نقشِ قدم لے کے چلو
دامنِ وقت پہ اب خون کے چھینٹے نہ پڑیں
ایک مرکز کی طرف دیر و حرم لے کے چلو
ہم مٹا ڈالیں گے سرمایہ و محنت کا تضاد
یہ عقیدہ ، یہ ارادہ ، یہ قسم لے کے چلو

وہ جو ہمراز رہا ، حاضر و مستقبل کا
اُس کے خوابوں کی خوشی ، رُوح کا غم لے کے چلو
جسم کی موت ، کوئی موت نہیں ہوتی ہے
جسم مٹ جانے سے انسان نہیں مَر جاتے
دھڑکنیں رُکنے سے ارمان نہیں مَر جاتے
سانس تھم جانے سے اعلان نہیں مر جاتے
ہونٹ جم جانے سے فرمان نہیں مَر جاتے
جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے

# اے شریف انسانو

(ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کے پس منظر میں لکھی گئی اور معاہدۂ تاشقند کی سالگرہ پر نشر کی گئی)

خون اپنا ہو یا پرایا ہو
نسلِ آدم کا خون ہے آخر
جنگ مشرق میں ہو کہ مغرب میں
امنِ عالم کا خون ہے آخر

بم گھروں پر گریں کہ سرحد پر
روحِ تعمیر زخم کھاتی ہے
کھیت اپنے جلیں کہ اوروں کے
زیست فاقوں سے تلملاتی ہے

ٹینک آگے بڑھیں، کہ پیچھے ہٹیں
کوکھ دھرتی کی بانجھ ہوتی ہے
فتح کا جشن ہو کہ ہار کا سوگ
زندگی میتوں پہ روتی ہے

جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے
جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی
آگ اور خون آج بخشے گی
بھوک اور احتیاج کل دے گی

اس لیۓ اے شریف انسانو!
جنگ ٹلتی رہے تو بہتر ہے
آپ اور ہم سبھی کے آنگن میں
شمع جلتی رہے تو بہتر ہے

(۲)

برتری کے ثبوت کی خاطر
خوں بہانا ہی کیا ضروری ہے
گھر کی تاریکیاں مٹانے کو
گھر جلانا ہی کیا ضروری ہے

جنگ کے اور بھی تو میداں ہیں
صرف میدانِ کشت و خوں ہی نہیں
حاصلِ زندگی خِرد بھی ہے
حاصلِ زندگی جنوں ہی نہیں

آؤ اس تیرہ بخت دنیا میں
فکر کی روشنی کو عام کریں
امن کو جن سے تقویت پہنچے
ایسی جنگوں کا اہتمام کریں

جنگ، وحشت سے، بربریّت سے
امن، تہذیب و ارتقاء کے لیے
جنگ، مرگ آفریں سیاست سے
امن، انسان کی بقا کے لیے

جنگ، افلاس اور غلامی سے
امن، بہتر نظام کی خاطر
جنگ بھٹکی ہوئی قیادت سے
امن، بے بس عوام کی خاطر

جنگ، سرمائے کے تسلّط سے
امن، جمہور کی خوشی کے لیے
جنگ، جنگوں کے فلسفے کے خلاف
امن، پُرامن زندگی کے لیے

# کیوں ہو؟

کل کے پھولوں سے تھا جس کا رشتہ آج کے غنچہ جبینوں میں کیوں ہو
سال خوردہ ایاغوں کی تلچھٹ، نوجواں آبگینوں میں کیوں ہو

ساعتِ فصلِ گُل ہے جوانی، کیوں نہ جشنِ مے و مہوشاں ہو
عاقبت کے عذابوں کا رونا، ان مُبارک مہینوں میں کیوں ہو

بُغض کی آگ، نفرت کے شعلے، میکشوں تک پہنچنے نہ پائیں
فصل یہ مندروں، مسجدوں کی، میکدوں کی زمینوں میں کیوں ہو

# اہلِ دل اور بھی ہیں

کیا ہوا گر مرے یاروں کی زبانیں چُپ ہیں
میرے شاہد، مرے یاروں کے سوا اور بھی ہیں

اہلِ دل اور بھی ہیں، اہلِ وفا اور بھی ہیں
ایک ہم ہی نہیں، دنیا سے خفا اور بھی ہیں
ہم پہ ہی ختم نہیں مسلکِ شوریدہ سری
چاک دل اور بھی ہیں، چاک قبا اور بھی ہیں

سر سلامت ہے تو کیا سنگِ ملامت کی کمی
جان باقی ہے تو پیکانِ قضا اور بھی ہیں
منصفِ شہر کی وحدت پہ نہ حرف آ جائے
لوگ کہتے ہیں کہ اربابِ جفا اور بھی ہیں

# ۲۶ جنوری

آؤ کہ آج غور کریں اِس سوال پر
دیکھے تھے ہم نے جو، وہ حسیں خواب کیا ہوئے

دولت بڑھی تو ملک میں افلاس کیوں بڑھا
خوشحالیٔ عوام کے اسباب کیا ہوئے

جو اپنے ساتھ ساتھ چلے کوئے دار تک
وہ دوست، وہ رفیق، وہ احباب کیا ہوئے

کیا مول لگ رہا ہے شہیدوں کے خون کا
مرتے تھے جن پہ ہم وہ سزایاب کیا ہوئے

بے کس برہنگی کو کفن تک نہیں نصیب
وہ وعدہ ہائے اطلس و کمخواب کیا ہوئے

جمہوریت نواز، بشر دوست، امن خواہ
خود کو جو خود دیئے تھے وہ القاب کیا ہوئے

مذہب کا روگ آج بھی کیوں لاعلاج ہے
وہ نسخہ ہائے نادر و نایاب کیا ہوئے

ہر کوچہ شعلہ زار ہے، ہر شہر قتل گاہ
یکجہتیٔ حیات کے آداب کیا ہوئے

صحرائے تیرگی میں بھٹکتی ہے زندگی
اُبھرے تھے جو افق پہ وہ مہتاب کیا ہوئے

مجرم ہوں میں اگر، تو گنہگار تم بھی ہو
اے رہبرانِ قوم خطاکار تم بھی ہو

# مَیں زندہ ہُوں

میں زندہ ہُوں یہ مشتہر کیجئے
مرے قاتلوں کو خبر کیجئے

زمیں سخت ہے آسماں دُور ہے
بسر ہو سکے تو بسر کیجئے

ستم کے بہت سے ہیں ردِّ عمل
ضروری نہیں چشم تر کیجئے

وہی ظُلم بارِ دگر ہے تو پھر
وہی جُرم بارِ دگر کیجئے

قفس توڑنا بعد کی بات ہے
ابھی خواہشِ بال و پَر کیجئے

# جشنِ غالب

اکیس برس گزرے آزادئ کامل کو
تب جا کے کہیں ہم کو غالب کا خیال آیا
تُربت ہے کہاں اُس کی مسکن تھا کہاں اُس کا
اب اپنے سخن پرور ذہنوں میں سوال آیا

سو سال سے جو تُربت چادر کو ترستی تھی
اب اس پہ عقیدت کے پھولوں کی نمائش ہے
اُردو کے تعلق سے کچھ بھید نہیں کُھلتا
یہ جشن یہ ہنگامہ، خدمت ہے کہ سازش ہے

جن شہروں میں گونجی تھی غالب کی نوا برسوں
اُن شہروں میں اب اُردو بے نام ونشاں ٹھہری
آزادیٔ کامل کا اعلان ہوا جس دن
معتوب زباں ٹھہری، غدّار زباں ٹھہری

جس عہدِ سیاست نے یہ زندہ زباں کچلی
اُس عہدِ سیاست کو مرحوموں کا غم کیوں ہے
غالبؔ جسے کہتے ہیں، اُردو ہی کا شاعر تھا
اُردو پہ ستم ڈھا کر غالبؔ پہ کرم کیوں ہے

یہ جشن، یہ ہنگامے، دلچسپ کھلونے ہیں
کچھ لوگوں کی کوشش ہے کچھ لوگ بہل جائیں
جو وعدۂ فردا پر اب ٹل نہیں سکتے ہیں
ممکن ہے کہ کچھ عرصہ اس جشن پہ ٹل جائیں

یہ جشن مبارک ہو، پر یہ بھی صداقت ہے
ہم لوگ حقیقت کے احساس سے عاری ہیں
گاندھی ہو کہ غالبؔ ہو انصاف کی نظروں میں
ہم دونوں کے قاتل ہیں، دونوں کے پُجاری ہیں

# گاندھی ہو یا غالبؔ ہو

گاندھی شتابدی اور غالبؔ صدی کے اختتام پر لکھی گئی

گاندھی ہو یا غالبؔ ہو

ختم ہوا دونوں کا جشن
آؤ، انہیں اب کر دیں دفن
ختم کرو تہذیب کی بات  بند کرو کلچر کا شور
ستیہ، اہنسا سب بکواس  ہم بھی قاتل، تم بھی چور
ختم ہوا دونوں کا جشن
آؤ، انہیں اب کر دیں دفن

وہ بستی، وہ گاؤں ہی کیا؟ جس میں ہریجن ہو آزاد
وہ قصبہ، وہ شہر ہی کیا؟ جو نہ بنے احمد آباد[۱]
ختم ہوا دونوں کا جشن
آؤ، انہیں اب کر دیں دفن
گاندھی ہو یا غالبؔ ہو دونوں کا کیا کام یہاں
اب کے برس بھی قتل ہوئی ایک کی شکشا اِک کی زباں
ختم ہوا دونوں کا جشن
آؤ، انہیں اب کر دیں دفن

---

۱؎ سال کے بدترین فرقہ وارانہ فساد کی طرف اشارہ ہے

# دیکھا ہے زندگی کو

دیکھا ہے زندگی کو کچھ اتنے قریب سے
چہرے تمام لگنے لگے ہیں عجیب سے

اے روحِ عصر جاگ، کہاں سو رہی ہے تو
آواز دے رہے ہیں پیمبر صلیب سے

اس رینگتی حیات کا کب تک اٹھائیں بار
بیمار اب اُلجھنے لگے ہیں طبیب سے

ہر گام پر ہے مجمعِ عشّاق منتظر
مقتل کی راہ ملتی ہے کوئے حبیب سے

اس طرح زندگی نے دیا ہے ہمارا ساتھ
جیسے کوئی نباہ رہا ہو رقیب سے

# لینن

(۱۹۱۷ء)

طبقوں میں بٹی دنیا صدیوں سے پریشاں تھی
غمناکیاں بستی تھیں آباد خرابوں سے
عیش ایک کا لاکھوں کی غربت سے پنپتا تھا
منسوب تھی یہ حالت، قدرت کے حسابوں سے
اخلاق پریشاں تھا، تہذیب ہراساں تھی
بدکار "حضوروں" سے، بدنسل "جنابوں" سے
عیّار سیاست نے ڈھانپا تھا جرائم کو
ارباب کلیسا کی حکمت کے نقابوں سے
انساں کے مقدّر کو آزاد کیا تُو نے
مذہب کے فریبوں سے، شاہی کے عذابوں سے

# لینن

(۱۹۷۰)

کیا جانیں تری اُمت کس حال کو پہنچے گی
بڑھتی چلی جاتی ہے تعداد اماموں کی

ہر گوشۂ مغرب میں، ہر خطۂ مشرق میں
تشریح دگرگوں ہے اب تیرے پیاموں کی

وہ لوگ جنہیں کل تک دعویٰ تھا رفاقت کا
تذلیل پہ اُترے ہیں، اپنوں ہی کے ناموں کی

بگڑے ہوئے تیور ہیں نوعمر سیاست کے
بپھری ہوئی سانسیں ہیں نومشق نظاموں کی

طبقوں سے نکل کر ہم فرقوں میں نہ بٹ جائیں
بن کر نہ بگڑ جائے تقدیر غلاموں کی

# صدیوں سے

صدیوں سے انسان یہ سنتا آیا ہے
دُکھ کی دھوپ کے آگے، سکھ کا سایا ہے

ہم کو ان سستی خوشیوں کا لوبھ نہ دو
ہم نے سوچ سمجھ کر غم اپنایا ہے

جھوٹ تو قاتل ٹھہرا، اُس کا کیا رونا
سچ نے بھی انساں کا خوں بہایا ہے

پیدائش کے دن سے موت کی زد میں ہیں
اس مقتل میں کون ہمیں لے آیا ہے

اوّل اوّل جس دل نے برباد کیا
آخر آخر وہ دل ہی کام آیا ہے

اُتنے دن احسان کیا دیوانوں پر
جتنے دن لوگوں نے ساتھ نبھایا ہے

# اے نئی نسل!

۲۲ر نومبر ۱۹۷۰ء کو گورنمنٹ کالج لدھیانہ کی گولڈن جوبلی منائی گئی، اس موقع پر کالج کے ایک سابق طالب علم کی حیثیت سے ساحرؔ صاحب کو خاص طور پر مدعو کیا گیا اور ان کی نمایاں ادبی اور تہذیبی خدمات کے پیشِ نظر مرکزی وزیر تعلیم شری آر. کے. وی راؤ نے انہیں کالج کی طرف سے گولڈ میڈل پیش کیا۔ ساحرؔ صاحب نے یہ نظم اس تقریب کیلئے لکھی اور اساتذہ اور نئے طالبعلموں کے اجتماع میں پڑھی

میرے اجداد کا وطن یہ شہر
میری تعلیم کا جہاں یہ مقام
میرے بچپن کی دوست یہ گلیاں
جن میں رُسوا ہوا شباب کا نام
یاد آتے ہیں ان فضاؤں میں
کتنے نزدیک اور دُور کے نام
کتنے خوابوں کے ملگجے چہرے
کتنی یادوں کے مرمریں اجسام

کتنے ہنگامے ، کتنی تحریکیں
کتنے نعرے جو تھے زباں زدِ عام
میں یہاں جب شعور کو پہنچا
اجنبی قوم کی تھی قوم غلام
یونین جیک درسگاہ پہ تھا
اور وطن میں تھا سامراجی نظام
اسی مٹی کو ہاتھ میں لے کر
ہم بنے تھے بغاوتوں کے امام
یہیں جانچے تھے دھرم کے وشواش
یہیں پرکھے تھے دین کے اوہام
یہیں منکر بنے روایت کے
یہیں توڑے رواج کے اصنام
یہیں نکھرا تھا ذوقِ نغمہ گری
یہیں اُترا تھا شعر کا الہام
میں جہاں بھی رہا، یہیں کا رہا
مجھ کو بھولے نہیں ہیں یہ درو بام

نام میرا جہاں جہاں پہنچا
ساتھ پہنچا ہے اِس دیار کا نام
میں یہاں میزباں بھی ، مہماں بھی
آپ جو چاہیں دیجئے مجھے نام
نذر کرتا ہوں ان فضاؤں کی
اپنا دل ، اپنی رُوح ، اپنا کلام
اور فیضانِ علم جاری ہو
اور اونچا ہو اس دیار کا نام
اور شاداب ہو یہ ارضِ حسین
اور مہکے یہ وادیٔ گلفام
اور اُبھریں صنم گری کے نقوش
اور چھلکیں مئے سخن کے جام
اور نکلیں وہ بے نوا ، جن کو
اپنا سب کچھ کہیں وطن کے عوام
قافلے آتے جاتے رہتے ہیں
کب ہوا ہے یہاں کسی کا قیام

نسل در نسل کام جاری ہے
کارِ دنیا کبھی ہوا نہ تمام
کل جہاں میں تھا آج تُو ہے وہاں
اے نئی نسل! تجھ کو میرا سلام

# نَے میں کچھ نہیں

نغمہ جو ہے تو رُوح میں ہے، نَے میں کچھ نہیں
گر تجھ میں کچھ نہیں، تو کسی شے میں کچھ نہیں
تیرے لہُو کی آنچ سے گرمی ہے جسم کی
مَے کے ہزار وصف سہی، مَے میں کچھ نہیں
جس میں خلوصِ فکر نہ ہو، وہ سخن فضول
جس میں نہ دل شریک ہو، اُس لے میں کچھ نہیں
کشکولِ فن اٹھا کے سوئے خسرواں نہ جا
اب دستِ اختیارِ جم و کے میں کچھ نہیں

# دل ابھی ــــــ!

زندگی سے اُنس ہے
حُسن سے لگاؤ ہے
دھڑکنوں میں آج بھی
عشق کا الاؤ ہے
دل ابھی بجُھا نہیں

رنگ بھر رہا ہوں مَیں
خاکۂ حیات میں
آج بھی ہوں منہمک
فکرِ کائنات میں
غم ابھی لُٹا نہیں

حرفِ حق عزیز ہے
ظُلم ناگوار ہے
عہدِ نَو سے آج بھی
عہد، استوار ہے
میں ابھی مَرا نہیں

# یہ زمیں جس قدر ـــــ!

یہ زمیں جس قدر سجائی گئی
زندگی کی تڑپ بڑھائی گئی

آئینے سے بگڑ کے بیٹھ گئے
جن کی صورت جنہیں دکھائی گئی

دشمنوں ہی سے بَیر نبھ جائے
دوستوں سے تو آشنائی گئی

نسل در نسل انتظار رہا
قصر ٹوٹے، نہ بے نوائی گئی

زندگی کا نصیب کیا کہیئے
ایک، سیتا تھی جو ستائی گئی

ہم نہ اوتار تھے، نہ پیغمبر
کیوں یہ عظمت ہمیں دلائی گئی

موت پائی صلیب پر ہم نے
عمر بن باس میں بتائی گئی

# بڑی طاقتیں

تم ہی تجویز صلح لاتے ہو
تم ہی سامانِ جنگ بانٹتے ہو
تم ہی کرتے ہو، قتل کا ماتم
تم ہی تیر و تفنگ بانٹتے ہو

# لشکر کشی

فوج حق کو کچل نہیں سکتی
فوج چاہے کسی یزید کی ہو
لاش اٹھتی ہے پھر علَم بن کر
لاش چاہے کسی شہید کی ہو

# مگر ظلم کے خلاف

ہم امن چاہتے ہیں، مگر ظلم کے خلاف
گر جنگ لازمی ہے تو پھر جنگ ہی سہی

ظالم کو جو نہ روکے، وہ شامل ہے ظلم میں
قاتل کو جو نہ ٹوکے، وہ قاتل کے ساتھ ہے
ہم سر بکف اُٹھے ہیں کہ حق فتح یاب ہو
کہہ دو اُسے جو لشکرِ باطل کے ساتھ ہے
اس ڈھنگ پر ہے زور، تو یہ ڈھنگ ہی سہی

ظالم کی کوئی ذات، نہ مذہب نہ کوئی قوم
ظالم کے لب پہ ذکر بھی ان کا گناہ ہے
پھلتی نہیں ہے شاخِ ستم اس زمین پر
تاریخ جانتی ہے زمانہ گواہ ہے
کچھ کور باطنوں کی نظر تنگ ہی سہی
یہ زر کی جنگ ہے نہ زمینوں کی جنگ ہے
یہ جنگ ہے بقا کے اصولوں کے واسطے
جو خون ہم نے نذر دیا ہے زمین کو
وہ خون ہے گلاب کے پھولوں کے واسطے
پھوٹے گی صبحِ امن، لہو رنگ ہی سہی

# توڑ لیں گے ہر اک شے سے رشتہ

توڑ لیں گے ہر اک شے سے رِشتہ توڑ دینے کی نوبت تو آئے
ہم قیامت کے خود منتظر ہیں، پر کسی دن قیامت تو آئے

ہم بھی سقراط ہیں عہدِ نَو کے، تشنہ لب ہی نہ مَر جائیں یارو
زہر ہو یا مئے آتشیں ہو، کوئی جامِ شہادت تو آئے

ایک تہذیب ہے دوستی کی، ایک معیار ہے دشمنی کا
دوستوں نے مروّت نہ سیکھی، دشمنوں کو عداوت تو آئے

رِند رستے میں آنکھیں بچھائیں، جو کہے بن سُنے مان جائیں
ناصحِ نیک طینت کسی شب سوئے کوئے ملامت تو آئے

علم و تہذیب، تاریخ و منطق، لوگ سوچیں گے ان مسئلوں پر
زندگی کے مشقّت کدے میں کوئی عہدِ فراغت تو آئے

کانپ اُٹھیں قصرِ شاہی کے گنبد، تھرتھرائے زمیں معبدوں کی
کوچہ گردوں کی وحشت تو جاگے، غمزدوں کو بغاوت تو آئے

# بات کریں

سزا کا حال سنائیں، جزا کی بات کریں
خدا ملا ہو جنہیں وہ خدا کی بات کریں

انہیں پتہ بھی چلے اور وہ خفا بھی نہ ہوں
اس احتیاط سے کیا مدعا کی بات کریں

ہمارے عہد کی تہذیب میں قبا ہی نہیں
اگر قبا ہو تو بندِ قبا کی بات کریں

ہر ایک دَور کا مذہب نیا خدا لایا
کریں تو ہم بھی مگر کس خدا کی بات کریں

وفا شعار کئی ہیں، کوئی حسیں بھی تو ہو
چلو پھر آج اسی بے وفا کی بات کریں

# پیار کا تحفہ

(اپنے جگری دوست یش چوپڑہ کی شادی کے موقع پر)

کارگر ہو گئی احباب کی تدبیر اب کے
مانگ لی آپ ہی دیوانے نے زنجیر اب کے

جس نے ہر دام میں آنے میں تکلّف برتا
لے اڑی ہے اسے زلفِ گرہ گیر اب کے

جو سدا حسن کی اقلیم میں ممتاز رہے
دل کے آئینے میں اتری ہے وہ تصویر اب کے

خواب ہی خواب جوانی کا مقدّر تھے کبھی
خواب سے بڑھ کے گلے مل گئی تعبیر اب کے

اجنبی خوش ہوئے اپنوں نے دعائیں مانگیں
اس سلیقے سے سنواری گئی تقدیر اب کے

یار کا جشن ہے اور پیار کا تحفہ ہیں یہ شعر
خود بخود ایک دُعا بن گئی تحریر اب کے

# میں پل دو پل کا شاعر ہوں

میں پل دو پل کا شاعر ہوں، پل دو پل مری کہانی ہے
پل دو پل میری ہستی ہے، پل دو پل میری جوانی ہے

مجھ سے پہلے کتنے شاعر، آئے اور آ کر چلے گئے
کچھ آہیں بھر کر لوٹ گئے، کچھ نغمے گا کر چلے گئے

وہ بھی اک پل کا قصّہ تھے، میں بھی اک پل کا قصّہ ہوں
کل تم سے جدا ہو جاؤں گا، گو آج تمہارا حصّہ ہوں

پل دو پل میں کچھ کہہ پایا، اتنی ہی سعادت کافی ہے
پل دو پل تم نے مجھ کو سنا، اتنی ہی عنایت کافی ہے

کل اور آئیں گے، نغموں کی کھلتی کلیاں چننے والے
مجھ سے بہتر کہنے والے تم سے بہتر سننے والے

ہر نسل اک فصل ہے دھرتی کی، آج اُگتی ہے کل کٹتی ہے
جیون وہ مہنگی مدرا ہے، جو قطرہ قطرہ بٹتی ہے

ساگر سے اُبھری لہر ہُوں میں، ساگر میں پھر کھو جاؤں گا
مٹی کی رُوح کا سپنا ہُوں، مٹی میں پھر سو جاؤں گا

کل کوئی مجھ کو یاد کرے، کیوں کوئی مجھ کو یاد کرے
مصروف زمانہ میرے لیے کیوں وقت اپنا برباد کرے

# گو مسلکِ تسلیم و رضا....

گو مسلکِ تسلیم و رضا بھی ہے کوئی چیز
پر غیرتِ اربابِ وفا بھی ہے کوئی چیز

کِھلتا ہے ہر اِک غنچۂ نَو جوشِ نمُو سے
یہ سچ ہے مگر لمسِ ہوا بھی ہے کوئی چیز

یہ بے رُخیٔ فطرتِ محبوب کے شاکی
اتنا بھی نہ سمجھے کہ ادا بھی ہے کوئی چیز

عبرت کدۂ دہر میں اے تارکِ دنیا
لذت کدہ جرم و خطا بھی ہے کوئی چیز

لپکے گا گریباں پہ تو محسوس کرو گے
اے اہلِ دُوَل، دستِ گدا بھی ہے کوئی چیز

# جو لطفِ میکشی ہے...!

جو لطفِ میکشی ہے نگاروں میں آئے گا
یا با شعور بادہ گساروں میں آئے گا

وہ جس کو خلوتوں میں بھی آنے سے عار ہے
آنے پہ آئے گا تو ہزاروں میں آئے گا

ہم نے خزاں کی فصل چمن سے نکال دی
ہم کو پیامِ مرگ بہاروں میں آئے گا

اس دورِ احتیاج میں جو لوگ جی لئے
ان کا بھی نام شعبدہ کاروں میں آئے گا

جو شخص مر گیا ہے وہ ملنے کبھی کبھی
پچھلے پہر کے سرد ستاروں میں آئے گا

# ورثہ

یہ وطن، تیری مری نسل کی جاگیر نہیں
سینکڑوں نسلوں کی محنت نے سنوارا ہے اسے

کتنے ذہنوں کا لہو، کتنی نگاہوں کا عرق
کتنے چہروں کی حیا، کتنی جبینوں کی شفق
خاک کی نذر ہوئی تب یہ نظارے بکھرے

پتھروں سے یہ تراشے ہوئے اصنام جواں
یہ صداؤں کے خم و پیچ، یہ رنگوں کی زباں
چمنیوں سے یہ نکلتا ہوا پُرپیچ دھواں

تیری تخلیق نہیں ہے، مری تخلیق نہیں
ہم اگر ضد بھی کریں اِس پہ تو تصدیق نہیں

علم سولی پہ چڑھا، تب کہیں تخمینہ بنا
زہر صدیوں نے پیا، تب کہیں نوشینہ بنا
سینکڑوں پاؤں کٹے، تب کہیں اک زینہ بنا

تیرے قدموں کے تلے، یا مرے قدموں کے تلے
نوعِ انساں کے شب و روز کی تقدیر نہیں
یہ وطن تیری مری نسل کی جاگیر نہیں
سینکڑوں نسلوں کی محنت نے سنوارا ہے اسے

تیرا غم کچھ بھی سہی، میرا اَلم کچھ بھی سہی
اہلِ ثروت کی سیاست کا ستم کچھ بھی سہی
کل کی نسلیں بھی کوئی چیز ہیں، ہم کچھ بھی سہی

اُن کا ورثہ ہُوں کھنڈر، یہ ستم ایجاد نہ کر
تیری تخلیق نہیں تو اسے برباد نہ کر

جس سے دہقان کو روزی نہیں ملنے پاتی
میں نہ دُوں گا تجھے وہ کھیت جلانے کا سبق
فصل باقی ہے تو تقسیم بدل سکتی ہے
فصل کی خاک سے کیا مانگے گا جمہور کا حق

پُل سلامت ہے تو، تو پار اُتر سکتا ہے
چاہے تبلیغِ بغاوت کے لیے ہی اُترے
ورنہ غالبؔ کی زباں میں مرے ہمدم مرے دوست
دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
سوچ لے پھر کوئی تعمیر گرانے جانا
تیری تعمیر سے ہے جنگ کہ تخریب سے جنگ

اہلِ منصب ہیں غلط کار تو اُن کے منصب
تیری تائید سے ڈھالے گئے، تو مجرم ہے

میری تائید سے ڈھالے گئے، میں مجرم ہوں
پٹڑیاں ریل کی، سڑکوں کی بسیں، فون کے تار
تیری اور میری خطاؤں کی سزا کیوں بھگتیں

اُن پہ کیوں ظلم ہو جن کی کوئی تقصیر نہیں
یہ وطن، تیری مری نسل کی جاگیر نہیں
سینکڑوں نسلوں کی محنت نے سنوارا ہے اُسے

تیرا شکوہ بھی بجا، میری شکایت بھی درست
رنگِ ماحول بدلنے کی ضرورت بھی درست
کون کہتا ہے کہ حالات پہ تنقید نہ کر
حکمرانوں کے غلط دعوؤں کی تردید نہ کر
تجھ کو اظہارِ خیالات کا حق حاصل ہے
اور یہ حق کوئی تاریخ کی خیرات نہیں
تیرے اور میرے رفیقوں نے لہو دے دے کر
ظلم کی خاک میں اس حق کا شجر بویا تھا
سالہا سال میں جو برگ و ثمر لایا ہے

اپنا حق مانگ مگر اُن کے تعاون سے نہ مانگ
جو ترے حق کا تصوّر ہی فنا کر ڈالیں
ہاتھ اٹھا اپنے، مگر ان کے جلو میں نہ اُٹھا
جو ترے ہاتھ ترے تن سے جُدا کر ڈالیں

خوابِ آزادیِ انساں کی یہ تعبیر نہیں
یہ وطن، تیری مری نسل کی جاگیر نہیں
سینکڑوں نسلوں کی محنت سنوارا ہے اسے

# گلشن گلشن پھُول

گُلشن گُلشن پھُول    دامن دامن دھُول
مرنے پر تعزیر    جینے پر محصُول
ہر جذبہ مصلوب    ہر خواہش مقتول
عشق پریشاں حال    نازِ حُسن ملول
نعرۂ حق معتوب    مکر و ریا مقبول

سنورا نہیں جہان
آتے گئے رسُول

# ـــــ نادار تک نہیں پہنچا

فن جو نادار تک نہیں پہنچا
ابھی معیار تک نہیں پہنچا
اُس نے بر وقت بے رُخی برتی
شوق، آزار تک نہیں پہنچا
عکسِ مے ہو، کہ جلوۂ گل ہو
رنگِ رُخسار تک نہیں پہنچا
حرفِ انکار سربلند رہا
ضعفِ اقرار تک نہیں پہنچا

حکم سرکار کی پہنچ مت پوچھ
اہل سرکار تک نہیں پہنچا
عدل گاہیں تو دُور کی شے ہیں
قتل اخبار تک نہیں پہنچا
انقلاباتِ دہر کی بنیاد
حق، جو حقدار تک نہیں پہنچا
وہ مسیحا نفس نہیں، جس کا
سلسلہ دار تک نہیں پہنچا

# آج کا پیار تھوڑا بچا کر رکھو

(ایوارڈ ملنے پر ساحر لدھیانوی کی طرف سے دنیا بھر کے انسانوں کے خراج تحسین کا جواب)

آپ کیا جانیں مجھ کو سمجھتے ہیں کیا
میں تو کچھ بھی نہیں
اس قدر پیار، اتنی بڑی بھیڑ کا، میں رکھوں گا کہاں ؟
اس قدر پیار رکھنے کے قابل نہیں میرا دل میری جان
مجھ کو اتنی محبّت نہ دو دوستو
سوچ لو دوستو !
پیار اک شخص کا بھی اگر مل سکے
تو بڑی چیز ہے زندگی کے لیے
آدمی کو مگر یہ بھی ملتا نہیں، یہ بھی ملتا نہیں
مجھ کو اتنی محبّت ملی آپ سے
یہ میرا حق نہیں، میری تقدیر ہے

میں زمانے کی نظروں میں کچھ بھی نہ تھا
میری آنکھوں میں اب تک وہ تصویر ہے
اس محبت کے بدلے میں کیا نذر دُوں
میں تو کچھ بھی نہیں
عزّتیں، شہرتیں، چاہتیں، اُلفتیں
کوئی بھی چیز دنیا میں رہتی نہیں
آج میں ہوں جہاں، کل کوئی اور تھا
آج اتنی محبّت نہ دو دوستو
کہ مرے کل کی خاطر نہ کچھ بھی رہے
آج کا پیار تھوڑا بچا کر رکھو
میرے کل کے لیے
کل جو گمنام ہے، کل جو سنسان ہے
کل جو انجان ہے، کل جو ویران ہے
میں تو کچھ بھی نہیں، میں تو کچھ بھی نہیں

# گاتا جائے بنجارہ

(ساحر کے گیت)

○

اپنے نغموں کی جھولی پھیلائے
در بدر پھر رہا ہوں
مجھ کو امن اور تہذیب کی بھیک دو!

# فہرست


کبھی کبھی مرے دل میں خیال ۲۶۷
سب میں شامل ہو مگر سب ۲۶۹
شرما کے یوں نہ دیکھ ادا کے ۲۷۰
میں نے دیکھا ہے کہ پھولوں ۲۷۱
جانے کیا تُو نے کہی ۲۷۳
پاؤں چھُو لینے دو پھولوں کو ۲۷۴
میرے دل میں آج کیا ہے ۲۷۵
ہم آپ کی آنکھوں میں اس دل ۲۷۶
نظر سے دل میں سمانے والے ۲۷۷
یہ زُلف اگر کھل کے بکھر جائے ۲۷۸
پگھلا ہے سونا دُور گگن پر ۲۷۹
پربتوں کے پیڑوں پہ شام کا ۲۸۰
میں نے شاید تمہیں پہلے بھی ۲۸۱
دُور رہ کر نہ کرو بات ۲۸۳
کشتی کا خاموش سفر ہے ۲۸۴
کون آیا کہ نگاہوں میں چمک ۲۸۶
چہرے پہ خوشی چھا جاتی ہے ۲۸۷
یہ پربتوں کے دائرے ۲۸۸
ہر وقت ترے حسن کا ہوتا ۲۹۰
غصے میں جو نکھرا ہے اس حسن ۲۹۱
ملے جتنی شراب، میں تو پیتا ہوں ۲۹۲
عمر خیام اور رقاصہ ۲۹۳
یہ حسن مرا یہ حسن ترا رنگین تو ہے ۲۹۵
مجھے مل گیا بہانہ تیری دید کا ۲۹۷
آج کی رات مرادوں کی برات ۲۹۸
شعر کا حسن ہو، نغموں کی جوانی ۲۹۹
ہم جب چلیں تو یہ جہاں جھومے ۳۰۰
تم بھی چلو، ہم بھی چلیں ۳۰۲
نہ تو کارواں کی تلاش ہے ۳۰۳
یار ہی میرا کپڑا لتا ۳۰۶
ملتی ہے زندگی میں محبت کبھی کبھی ۳۰۸
سرمئی رات ہے ستارے ہیں ۳۰۹
نغمہ و شعر کی سوغات کسے پیش کروں ۳۱۰
اپنا دل پیش کروں، اپنی وفا ۳۱۱
سلام حسرت قبول کر لو ۳۱۲

بھولے سے محبت کر بیٹھا ٣١٣
بھول سکتا ہے بھلا کون یہ پیاری ٣١٤
یہ بہاروں کا سماں ٣١٥
آج سجن موہے انگ لگا لو ٣١٦
ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر کہ دل ابھی ٣١٧
آج کیوں ہم سے پردہ ہے ؟ ٣١٩
مطلب نکل گیا ہے تو پہچانتے نہیں ٣٢٢
مجھے گلے سے لگا لو بہت اداس ٣٢٣
نیلے گگن کے تلے، دھرتی کا پیار پلے ٣٢٤
کسی پتھر کی مورت سے محبت کا ٣٢٥
جو وعدہ کیا وہ نبھانا پڑے گا ٣٢٦
تیرے در پہ آیا ہوں، کچھ لے ٣٢٨
تم اگر ساتھ دینے کا وعدہ کرو ٣٢٩
جرمِ الفت پہ ہمیں لوگ سزا ٣٣١
غم کیوں ہو ؟ ٣٣٢
میں ہر اک پل کا شاعر ہوں ٣٣٣
یوں تو حسن ہر جگہ ہے ٣٣٥
ساتھی ہاتھ بڑھانا ٣٣٧
یہ دیش ہے ویر جوانوں کا ٣٣٩
دھرتی ماں کا مان ٣٤١
وہ صبح کبھی تو آئے گی ٣٤٢
رات کے راہی تھک مت جانا ٣٤٥
رات بھر کا ہے مہمان اندھیرا ٣٤٦
اب کوئی گلشن نہ اُجڑے ٣٤٧
زور لگا کے ہیّا ٣٤٨
آپ نہ جانے مجھ کو سمجھتے ہیں کیا ؟ ٣٥٠
رنگ اور نور کی بارات کسے ٣٥٢
چھو لینے دو نازک ہونٹوں کو ٣٥٣
یہ رات یہ چاندنی پھر کہاں ٣٥٤
تم اپنا رنج و غم اپنی پریشانی ٣٥٦
پونچھ کر اشک اپنی آنکھوں سے ٣٥٧
میں جاگوں ساری رین ٣٥٨
ہر طرف حسن ہے جوانی ہے ٣٥٩
نہیں کیا تو کر کے دیکھ ٣٦١
غیروں پہ کرم اپنوں پہ ستم ٣٦٣
تم اگر مجھ کو نہ چاہو تو کوئی ٣٦٤
چلو اک بار پھر سے اجنبی بن ٣٦٦
اس جان دو عالم کا جلوہ ٣٦٧
جو ہم میں ہے وہ متوالی ادا ٣٧٠
ہر طرح کے جذبات کا اعلان ہیں ٣٧٢
جیو تو ایسے جیو جیسے سب ٣٧٣
پگھلی آگ ہے ساغر بھر لے ٣٧٥
موت کبھی بھی مل سکتی ہے ٣٧٧
بانٹ کے کھاؤ اس دنیا میں ٣٧٨

توراَمن درپن کہلائے ۳۷۹
اے دل زباں نہ کھول ۳۸۰
من رے! تو کاہے نہ ۳۸۱
تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر ۳۸۲
کل جہاں بستی تھیں خوشیاں ۳۸۳
اپنے اندر ذرا جھانک میرے وطن ۳۸۴
تم چلی جاؤ گی، پرچھائیاں رہ جائیں ۳۸۶
سانجھ کی لالی سلگ سلگ کر بن گئی ۳۸۸
میں جب بھی اکیلی ہوتی ہوں ۳۸۹
آنکھ کھلتے ہی تم چھپ گئے ہو ۳۹۰
برباد محبت کی دعا ساتھ لیے جا ۳۹۱
ہم انتظار کریں گے ۳۹۲
اتنی حسیں، اتنی جواں رات ۳۹۳
جو بات تجھ میں ہے تری تصویر ۳۹۴
ہر چیز زمانے کی جہاں پر تھی ۳۹۵
زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ ۳۹۶
میں نے شاید تمہیں پہلے بھی ۳۹۸
یہ وادیاں یہ فضائیں بلا رہی ۴۰۰
آپ آئے تو خیال دل ناشاد ۴۰۱
میں یہ کہتی ہوں کہ کس روز ۴۰۲
آج رونا پڑا تو سمجھے ۴۰۳
دو شعر ۴۰۵
کھلے گگن کے نیچے پنچھی گھومیں ۴۰۶
رات بھی ہے کچھ بھیگی بھیگی ۴۰۷
جسے تو قبول کر لے وہ ادا ۴۰۹
الجھن سلجھے نہ، رستہ سوجھے ۴۱۰
کیا دیکھا او نینوں والی، نیناں ۴۱۲
جب بھی جی چاہے نئی دنیا ۴۱۳
جائیں تو جائیں کہاں ۴۱۴
انہیں کھو کر دکھے دل کی ۴۱۵
تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے ۴۱۶
کبھی خود پہ کبھی حالات پہ ۴۱۷
اشکوں میں جو پایا ہے ۴۱۸
میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا ۴۱۹
بجھا دیئے ہیں خود اپنے ہاتھوں ۴۲۱
تری دنیا میں جینے سے تو بہتر ہے ۴۲۲
تنگ آ چکے ہیں کشمکش زندگی سے ہم ۴۲۳
لو اپنا جہاں دنیا والو ۴۲۴
میں پل دو پل کا شاعر ہوں ۴۲۵
دو بوندیں ساون کی ۴۲۷
کوئی دل کی چاہت سے مجبور ہے ۴۲۸
جانے وہ کیسے لوگ تھے ۴۳۰

آسماں پہ ہے خدا اور زمیں پہ ہم ۴۳۱
ان اُجلے محلوں کے تلے ۴۳۲
محفل سے اُٹھ جانے والو! ۴۳۴
تم نے کتنے سپنے دیکھے ۴۳۶
دیکھا ہے زندگی کو کچھ اتنا قریب سے ۴۳۷
سنبھل اے دل، تڑپنے اور ۴۳۸
نہ تو زمیں کے لیے ہے ۴۴۰
وفا کے نام پہ کتنے گناہ ہوتے ہیں ۴۴۱
جیون کے سفر میں راہی ۴۴۳
مایوس تو ہوں وعدے سے ترے ۴۴۴
اب وہ کرم کریں کہ ستم ۴۴۵
میری مانگ کے رنگ میں تو نے ۴۴۶
لوگ عورت کو فقط جسم سمجھ لیتے ہیں ۴۴۷
بول نہ بول اے جلنے والے ۴۴۹
یہ محلوں، یہ تختوں، یہ تاجوں ۴۵۰
دیواروں کا جنگل جس کا آبادی ۴۵۲
موت کتنی بھی سنگ دل ہو ۴۵۴
سنسار کی ہر شے کا اتنا ہی ۴۵۵
میں زندگی کا ساتھ نبھاتا چلا ۴۵۶
زندگی ظلم سہی، جبر سہی، غم سہی ۴۵۷
بستی بستی، پربت پربت گاتا ۴۵۸
اپنی دنیا پہ صدیوں سے چھائی ۴۶۰
یہ دنیا دو رنگی ہے ۴۶۲
کیا ملیے ایسے لوگوں سے ۴۶۴
مہرباں کیسے کیسے، ۴۶۵

دھرتی کی سلگتی چھاتی سے ۴۶۷
میں نے پی شراب، ۴۶۹
انصاف کا ترازو، جو ہاتھ ۴۷۱
خدائے برتر! تری زمیں پر ۴۷۳
برسو رام دھڑاکے سے ۴۷۴
عورت نے جنم دیا مردوں کو ۴۷۵
یہ کوچے یہ نیلام گھر دل کشی کے ۴۷۷
لاگا چنری میں داغ چھپاؤں کیسے ۴۸۰
کام، کرودھ اور لوبھ کا مارا ۴۸۲
کعبے میں رہو یا کاشی میں ۴۸۳
ایشور، اللہ تیرے نام ۴۸۴
سنسار سے بھاگے پھرتے ہو ۴۸۵
آنا ہے تو آ، راہ میں کچھ ۴۸۶
تیری ہے زمیں، تیرا آسماں ۴۸۷
بچے من کے سچے، سارے جگ ۴۸۹
تو مرے پیار کا پھول ہے کہ ۹۰
تو میرے ساتھ رہے گا منے ۹۱
اے میرے ننھے گلفام ۹۳
ترے بچپن کو جوانی کی دعا دیتی ہوں ۹۵
تیرا مجھ سے ہے پہلے کا ناتا ۱۷
میرے بھیا، میرے چندا ۱۹
بابل کی دعائیں لیتی جا ۰
تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا ۱

○

کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے!

کہ جیسے تجھ کو بنایا گیا ہے میرے لیے
تو اب سے پہلے ستاروں میں بس رہی تھی کہیں
تجھے زمیں پہ بُلایا گیا ہے میرے لیے
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے

کہ یہ بدلتی نگاہیں میری امانت ہیں
یہ گیسوؤں کی گھنی چھاؤں ہے مری خاطر
یہ ہونٹ اور یہ بانہیں میری امانت ہیں
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے!

کہ جیسے بجتی ہیں شہنائیاں سی راہوں میں
سہاگ رات ہے گھونگھٹ اٹھا رہا ہوں میں
سمٹ رہی ہے تو شرما کے اپنی بانہوں میں
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے!

کہ جیسے تو مجھے چاہے گی عمر بھر یوں ہی
کہ اٹھے گی مری طرف پیار کی نظر یوں ہی
میں جانتا ہوں کہ تو غیر ہے مگر یوں ہی
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے!

○

سب میں شامل ہو مگر سب سے جدا لگتی ہو
صرف ہم سے نہیں خود سے بھی جُدا لگتی ہو

آنکھ اُٹھتی ہے نہ جھکتی ہے کسی کی خاطر
سانس چڑھتی ہے نہ رکتی ہے کسی کی خاطر
جو کسی در پہ نہ ٹھہرے وہ ہوا لگتی ہو

زُلف لہرائے تو آنچل میں چُھپا لیتی ہو
ہونٹ تھرائے تو دانتوں میں دبا لیتی ہو
جو کبھی کھل کے نہ برسے وہ گھٹا لگتی ہو

جاگی جاگی نظر آتی ہو نہ سوئی سوئی!
تم جو ہو اپنے خیالات میں کھوئی کھوئی
کسی مایوس مصوّر کی دعا لگتی ہو!

○

شرما کے یوں نہ دیکھ ادا کے مقام سے
اب بات بڑھ چکی ہے حیا کے مقام سے

تصویر کھینچ لی ہے ترے شوخ حسن کی
میری نظر نے آج خطا کے مقام سے

دنیا کو بھول کر مری بانہوں میں جھول جا
آواز دے رہا ہوں وفا کے مقام سے

دل کے معاملے میں نتیجے کی فکر کیا
آگے ہے عشق جرم و سزا کے مقام سے

○

## دوگانا:

ا: میں نے دیکھا ہے کہ پھولوں سے لدی شاخوں میں
تم لچکتی ہوئی یوں میرے قریب آئی ہو
جیسے مدت سے یونہی ساتھ رہا ہو اپنا
جیسے اب کی نہیں، برسوں کی شناسائی ہو

ب: میں نے دیکھا ہے کہ گاتے ہوئے جھرنوں کے قریب
اپنی بے تابئ جذبات کہی ہے تم نے
کانپتے ہونٹوں سے، رُکتی ہوئی آواز کے ساتھ
جو مرے دل میں تھی وہ بات کہی ہے تم نے

ا: آنچ دینے لگا قدموں کے تلے برف کا فرش
آج جانا کہ محبت میں ہے گرمی کتنی
سنگِ مرمر کی طرح سخت بدن میں تیرے
آگئی ہے میرے چھُو لینے سے نرمی کتنی

ب: ہم چلے جاتے ہیں، اور دُور تلک کوئی نہیں
صرف پتوں کے چٹخنے کی صدا آتی ہے
دل میں کچھ ایسے خیالات نے کروٹ لی ہے
مجھ کو تم سے نہیں، اپنے سے حیا آتی ہے

○

جانے کیا تو نے کہی
جانے کیا میں نے سُنی
بات کچھ بن ہی گئی

سنسناہٹ سی ہوئی
تھرتھراہٹ سی ہوئی
جاگ اُٹھے خواب کئی
بات کچھ بن ہی گئی

نین جُھک جُھک کے اُٹھے
پاؤں رک رک کے اُٹھے
ہو گئی چال نئی
بات کچھ بن ہی گئی

زُلف شانے پہ مُڑی
ایک خوشبو سی اُڑی
کُھل گئے راز کئی
بات کچھ بن ہی گئی
جانے کیا تُو نے کہی

○

## دوگانا:

ا : پاؤں چھو لینے دو پھولوں کو عنایت ہوگی
ورنہ ہم کو نہیں، ان کو بھی شکایت ہوگی

ب : آپ جو پھول بچھائیں انہیں ہم ٹھکرائیں
ہم کو ڈر ہے کہ یہ توہینِ محبت ہوگی

ا : دل کی بے چین امنگوں پہ کرم فرماؤ
اتنا رُک رُک کے چلوگی تو قیامت ہوگی

ب : شرم روکے ہے اِدھر، شوق اُدھر کھینچے ہے
کیا خبر تھی کبھی اس دل کی یہ حالت ہوگی

ا : شرم غیروں سے ہوا کرتی ہے اپنوں سے نہیں
شرم ہم سے بھی کروگی تو مصیبت ہوگی

مرے دل میں آج کیا ہے، تو کہے تو میں بتا دُوں
تری زُلف پھر سنواروں، تری مانگ پھر سجا دُوں

مجھے دیوتا بنا کر تری چاہتوں نے پُوجا
مرا پیار کہہ رہا ہے میں تجھے خدا بنا دُوں

کوئی ڈھونڈنے بھی آئے تو ہمیں نہ ڈھونڈ پائے
تو مجھے کہیں چھپا دے، میں تجھے کہیں چھپا دُوں

میرے بازوؤں میں آ کر تیرا درد چین پائے
ترے گیسوؤں میں چھُپ کر میں جہاں کے غم بھلا دُوں

تری زُلف پھر سنواروں تری مانگ پھر سجا دُوں
مرے دل میں آج کیا ہے تو کہے تو میں بتا دُوں

○

## دوگانا :

ا۔ ہم آپ کی آنکھوں میں اس دل کو بسا دیں تو؟
ب۔ ہم موند کے پلکوں کو اس دل کو سزا دیں تو؟

ا۔ ان زلفوں میں گوندھیں گے ہم پھول محبت کے
ب۔ زلفوں کو جھٹک کر ہم یہ پھول گرا دیں تو ۔۔؟

ا۔ ہم آپ کو خوابوں میں لا لا کے ستائیں گے
ب۔ ہم آپ کی آنکھوں سے نیندیں ہی اڑا دیں تو؟

ا۔ ہم آپ کے قدموں پر گر جائیں گے غش کھا کے
ب۔ اس پر بھی نہ ہم اپنے آنچل کی ہوا دیں تو ؟

○

نظر سے دل میں سمانے والے، مری محبّت ترے لیے ہے
وفا کی دنیا میں آنے والے، وفا کی دولت ترے لیے ہے

کھڑی ہُوں میں تیرے راستے میں، جواں اُمیدوں کے پھول لے کر
مہکتی زلفوں، بہکتی نظروں کی گرم جنّت ترے لیے ہے

سوا تری آرزُو کے اس دل میں کوئی بھی آرزُو نہیں ہے
ہر ایک جذبہ ہر ایک دھڑکن ہر ایک حسرت ترے لیے ہے

مرے خیالوں کے نرم پودوں سے جھانک کر مسکرانے والے
ہزار خوابوں سے جو سجی ہے وہ اِک حقیقت ترے لیے ہے

○

یہ زُلف اگر کُھل کے بکِھر جائے تو اچھا
اس رات کی تقدیر سنور جائے تو اچھا

جس طرح سے تھوڑی سی ترے ساتھ کٹی ہے
باقی بھی اسی طرح گزر جائے تو اچھا

دنیا کی نگاہوں میں بھلا کیا ہے بُرا کیا
یہ بوجھ اگر دل سے اُتر جائے تو اچھا

ویسے تو تمھیں نے مجھے برباد کیا ہے
الزام کسی اور کے سر جائے تو اچھا
یہ زُلف اگر کُھل کے بکھر جائے تو اچھا

○

پگھلا ہے سونا دور گگن پر، پھیل رہے ہیں شام کے سائے
خاموشی کچھ بول رہی ہے
بھید انوکھے کھول رہی ہے
پنکھ پکھیرو سوچ میں گُم ہیں، پیڑ کھڑے ہیں سیس جھکائے
پگھلا ہے سونا دُور گگن پر، پھیل رہے ہیں شام کے سائے
دھندلے دھندلے مست نظارے
اُڑتے بادل، مُڑتے دھارے
چھُپ کے نظر سے جانے یہ کس نے رنگ رنگیلے کھیل رچائے
پگھلا ہے سونا دور گگن پر، پھیل رہے ہیں شام کے سائے
کوئی بھی اُس کا راز نہ جانے
ایک حقیقت لاکھ فسانے
ایک ہی جلوہ شام سویرے، بھیس بدل کر سامنے آئے
پگھلا ہے سونا دُور گگن پر، پھیل رہے ہیں شام کے سائے!

○

پربتوں کے پیڑوں پر شام کا بسیرا ہے
سرمئی اُجالا ہے، چمپئی اندھیرا ہے

دونوں وقت ملتے ہیں دو دِلوں کی صورت سے
آسماں نے خوش ہو کر رنگ سا بکھیرا ہے

ٹھہرے ٹھہرے پانی میں گیت سرسراتے ہیں
بھیگے بھیگے جھونکوں میں خوشبوؤں کا ڈیرا ہے

کیوں نہ جذب ہو جائیں اس حسین نظارے میں
روشنی کا جھُرمٹ ہے مستیوں کا گھیرا ہے

○

میں نے شاید تمھیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے

اجنبی سی ہو مگر غیر نہیں لگتی ہو
وہم سے بھی جو ہو نازک وہ یقیں لگتی ہو
ہائے یہ پھول سا چہرہ یہ گھنیری زلفیں
میرے شعروں سے بھی تم مجھ کو حسیں لگتی ہو
میں نے شاید تمھیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے
دیکھ کر تم کو کسی رات کی یاد آتی ہے
ایک خاموش ملاقات کی یاد آتی ہے
ذہن میں حُسن کی ٹھنڈک کا اثر جاگتا ہے
آنچ دیتی ہوئی برسات کی یاد آتی ہے
میں نے شاید تمھیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے

میری آنکھوں پہ جھکی رہتی ہیں پلکیں جس کی
تم وہی میرے خیالوں کی پری ہو کہ نہیں
کہیں پہلے کی طرح پھر تو نہ کھو جاؤ گی
جو ہمیشہ کے لیے ہو وہ خوشی ہو کہ نہیں

میں نے شاید تمھیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے

○

دُور رہ کر نہ کرو بات، قریب آ جاؤ
یاد رہ جائے گی یہ رات، قریب آ جاؤ

ایک مدّت سے تمنّا تھی تمھیں چھُونے کی
آج بس میں نہیں جذبات، قریب آ جاؤ

سرد شعلے سے بھڑکتے ہیں بدن میں شعلے
جان لے لے گی یہ برسات، قریب آ جاؤ

اس قدر ہم سے جھجکنے کی ضرورت کیا ہے
زندگی بھر کا ہے اب ساتھ، قریب آ جاؤ

○

## دوگانا:

ا : کشتی کا خاموش سفر ہے، شام بھی ہے تنہائی بھی
دُور کنارے پر بجتی ہے، لہروں کی شہنائی بھی
آج مجھے کچھ کہنا ہے

ب : لیکن یہ شرمیلی نگاہیں مجھ کو اجازت دیں تو کہوں
خود میری بے تاب امنگیں تھوڑی فرصت دیں تو کہوں
آج مجھے کچھ کہنا ہے

ا : جو کچھ تم کو کہنا ہے وہ میرے ہی دل کی بات نہ ہو
جو ہے میرے خوابوں کی منزل اس منزل کی بات نہ ہو
کہہ بھی دو، جو کہنا ہے

ا : کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے، کہہ کر بات نہ کھو بیٹھوں
یہ جو ذرا سا ساتھ ملا ہے، یہ بھی ساتھ نہ کھو بیٹھوں
آج مجھے کچھ کہنا ہے

ب : کب سے تمہارے رستے میں میں پھول بچھائے بیٹھی ہوں
کہہ بھی چکو جو کہنا ہے، میں آس لگائے بیٹھی ہوں
کہہ بھی دو، جو کہنا ہے

دل نے دل کی بات سمجھ لی، اب مُنہ سے کیا کہنا ہے
آج نہیں تو کل کہہ لیں گے اب تو ساتھ ہی رہنا ہے
کہہ بھی دو، جو کہنا ہے!
چھوڑو، اب کیا کہنا ہے!!

کون آیا کہ نگاہوں میں چمک جاگ اُٹھی
دل کے سوئے ہوئے تاروں میں کھنک جاگ اٹھی

کس کے آنے کی خبر لے کے ہوائیں آئیں
جسم سے پھول چٹکنے کی صدائیں آئیں
روح کھلنے لگی، سانسوں میں مہک جاگ اُٹھی
دل کے سوئے ہوئے تاروں میں کھنک جاگ اٹھی

کس نے یوں میری طرف دیکھ کے باہیں کھولیں
شوخ جذبات نے سینے میں نگاہیں کھولیں
ہونٹ تپنے لگے، زلفوں میں لچک جاگ اٹھی
دل کے سوئے ہوئے تاروں میں کھنک جاگ اُٹھی

کس کے ہاتھوں نے مرے ہاتھوں سے کچھ مانگا ہے
کس کے خوابوں نے مرے خوابوں سے کچھ مانگا ہے
دل مچلنے لگا آنچل میں دھنک جاگ اُٹھی
دل کے سوئے ہوئے تاروں میں کھنک جاگ اُٹھی

چہرے پہ خوشی چھا جاتی ہے آنکھوں میں سُرور آجاتا ہے
جب تم مجھے اپنا کہتے ہو اپنے پہ غرور آجاتا ہے

تم حُسن کی خود اِک دنیا ہو شاید یہ تمہیں معلوم نہیں
محفل میں تمہارے آنے سے ہر چیز پہ نُور آجاتا ہے

ہم پاس سے تم کو کیا دیکھیں، تم جب بھی مقابل ہوتے ہو
بیتاب نگاہوں کے آگے پردہ سا ضرور آجاتا ہے

جب تم سے محبت کی ہم نے تب جا کے کہیں یہ راز کھُلا
مرنے کا سلیقہ آتے ہی جینے کا شعور آجاتا ہے

○

یہ پرتوں کے دائرے یہ شام کا دھواں
ایسے میں کیوں نہ چھیڑ دیں دلوں کی داستاں

ذرا سی زُلف کھول دو
خزاں میں عطر گھول دو
نظر جو کہہ چکی ہے وُہ
بات مُنہ سے بول دو
کہ جھوم اُٹھے نگاہ میں بہاروں کا سماں

یہ چُپ بھی اک سوال ہے
عجیب دل کا حال ہے
یہ اِک خیال کھو گیا
بس اب یہی خیال ہے

یہ رنگ روپ یہ پَون!
چمکتے چاند کا بدن
بُرا نہ مانو تُم اگر!
تو چوم لوں کِرن کِرن
کہ آج حوصلوں میں ہیں بلا کی گرمیاں!

○

ہر وقت ترے حُسن کا ہوتا ہے سماں اور
ہر وقت مجھے چاہیے اندازِ بیاں اور

پھولوں سا کبھی نرم ہے شعلوں سا کبھی گرم
مستانہ ادائیں کبھی شوخی ہے کبھی شرم
ہر صبح گماں اور ہے ہر رات گماں اور

ملنے نہیں پاتیں ترے جلووں سے نگاہیں!
تھکنے نہیں پاتیں گلے لپٹا کے یہ باہیں!
چھو لینے سے ہوتا ہے ترا جسم جواں اور

پلتا ہے ترے حُسن کا طوفانِ بہاراں
تو اپنی مثال آپ ہے اے جانِ بہاراں
دنیا کے حسینوں میں نہیں تجھ سا جواں اور

○

غصے میں جو نکھرا ہے، اُس حسن کا کیا کہنا
کچھ دیر ابھی ہم سے تم یوں ہی خفا رہنا

اس حسن کے شعلے کی تصویر بنا لیں ہم
ان گرم نگاہوں کو سینے سے لگا لیں ہم

پل بھر اسی عالم میں اے جانِ ادا رہنا
کچھ دیر ابھی ہم سے، تم یوں ہی خفا رہنا

یہ دہکا ہوا چہرہ، یہ بکھری ہوئی زلفیں
یہ بڑھتی ہوئی دھڑکن، یہ چڑھتی ہوئی سانسیں

سامانِ قضا ہو تم، سامانِ قضا رہنا
کچھ دیر ابھی ہم سے تم یوں ہی خفا رہنا

پہلے بھی حسیں تھیں تم لیکن یہ حقیقت ہے
وہ حسن مصیبت تھا، یہ حسن قیامت ہے

اوروں سے تو بڑھ کر ہو خود سے بھی سوا رہنا
کچھ دیر ابھی ہم سے تم یوں ہی خفا رہنا

○

ملے جتنی شراب، میں تو پیتا ہُوں
رکھے کون یہ حساب میں تو پیتا ہُوں

ایک انسان ہُوں مَیں فرشتہ نہیں
جو فرشتے بنیں، اُن سے رشتہ نہیں
کہو اچھا یا خراب، میں تو پیتا ہُوں
ملے جتنی شراب، میں تو پیتا ہُوں

ہوش مجھ کو رہے تو سِتم گھیر لیں
کئی دکھ گھیر لیں، کئی غم گھیر لیں
سہے کون یہ عذاب، میں تو پیتا ہُوں
ملے جتنی شراب، میں تو پیتا ہُوں

کوئی اپنا اگر ہو تو ٹوکے مجھے
میں غلط کر رہا ہوں تو روکے مجھے
کسے دینا ہے حساب ہیں تو پیتا ہُوں
مِلے جتنی شراب، میں تو پیتا ہُوں

○

**عُمر خیام :**

مقدّر کا لکھا مٹتا نہیں آنسو بہانے سے
یہ وہ ہونی ہے جو ہو کر رہے گی ہر بہانے سے
اگر جینے کی خواہش ہے تو مستوں کی طرح جی لے
کہ محفل ہوش کی سُونی پڑی ہے اک زمانے سے

**رقاصہ :**

مچلتی اُمنگیں کہیں سو نہ جائیں
یہ صبحیں یہ شامیں یونہی کھو نہ جائیں
کوئی صبح لے لے کوئی شام لے لے
جوانی کے سر کوئی الزام لے لے

عمر خیام :

یہ موسم، یہ ہوا ، یہ رُت سہانی پھر نہ آئے گی
ارے او جینے والے زندگانی پھر نہ آئے گی
کوئی حسرت نہ رکھ دل میں یہ دنیا چار دن کی ہے
جوانی موجِ دریا ہے، جوانی پھر نہ آئے گی

رقاصہ :

نگاہیں ملا ، اور اک جام لے لے
جوانی کے سر کوئی الزام لے لے
گناہوں کے سائے میں پلتی ہے جنّت
حسینوں کے ہمراہ چلتی ہے جنّت
حسینوں کے پہلو میں آرام لے لے
جوانی کے سر کوئی الزام لے لے

یہ حُسن مرا یہ عشق ترا رنگین تو ہے بدنام سہی
مُجھ پر تو کئی الزام لگے ، تجھ پر بھی کوئی الزام سہی

اس رات کی نکھری رنگت کو کچھ اور نکھر جانے دے ذرا
نظروں کو بہک جانے دے ذرا زلفوں کو بکھر جانے دے ذرا
کچھ دیر کی ہی تسکین سہی ، کچھ دیر کا ہی آرام سہی

جذبات کی کلیاں چُننی ہیں اور پیار کا تحفہ دینا ہے
لوگوں کی نگاہیں کچھ بھی کہیں لوگوں سے ہمیں کیا لینا ہے
یہ خاص تعلق آپس کا دنیا کی نظر میں عام سہی

رسوائی کے ڈر سے گھبرا کر ہم ترکِ وفا کب کرتے ہیں
جس دل کو بسالیں پہلو میں اس دل کو جُدا کب کرتے ہیں
جو حشر ہوا ہے لاکھوں کا اپنا بھی وہی انجام سہی

کب غم کی گھٹائیں چھا جائیں معصوم خوشی کو علم نہیں
ہم آج تو جی لیں جی بھر کے، کل کیا ہو کسی کو علم نہیں
اک اور رسیلی صبح سہی اک اور نشیلی شام سہی

○

مجھے مل گیا بہانہ تیری دید کا
کیسی خوشی لے کے آیا چاند عید کا
زلف مچل کے کھل کھل جائے
چاند میں مستی گھل گھل جائے
ایسی خوشی آج ملی، آنکھوں میں نام نہیں نیند کا
جاگتی آنکھیں بُنتی ہیں سپنے
تجھ کو بٹھا کے پہلو میں اپنے
دل کی لگی ایسی بڑھی، آنکھوں میں نام نہیں نیند کا
آتے ہی تیرے چٹکی ہیں کلیاں
دل بن بن کے دھڑکی ہیں گلیاں
ایسی سجی رات میری، آنکھوں میں نام نہیں نیند کا
کیسی خوشی لے کے آیا چاند عید کا

○

آج کی رات مرادوں کی برات آئی ہے

آج کی رات نہیں شکوے شکایت کے لیے
آج ہر لمحہ، ہر اک پل ہے محبّت کے لیے
ریشمی سیج ہے، مہکی ہوئی تنہائی ہے
آج کی رات مرادوں کی برات آئی ہے

ہر گُنہ آج مقدس ہے فرشتوں کی طرح
کانپتے ہاتھوں کو مل جانے دو رشتوں کی طرح
آج ملنے میں نہ الجھن ہے نہ رسوائی ہے
آج کی رات مرادوں کی برات آئی ہے

اپنی زُلفیں مرے شانے پہ بکھر جانے دو
اس حسیں رات کو کچھ اور نکھر جانے دو
صبح نے آج نہ آنے کی قسم کھائی ہے
آج کی رات مرادوں کی برات آئی ہے

○

شعر کا حُسن ہو، نغموں کی جوانی ہو تم
اِک دھڑکتی ہوئی شاداب کہانی ہو تم

آنکھ ایسی کہ کنول تم سے نشانی مانگے
زُلف ایسی کہ گھٹا شرم سے پانی مانگے
جس طرف سے بھی نظر ڈالو سہانی ہو تم

جسم ایسا کہ اجنتا کا عمل یاد آئے
سنگِ مرمر میں ڈھلا تاج محل یاد آئے
پگھلے پگھلے ہوئے رنگوں کی جوانی ہو تم
شعر کا حُسن ہو، نغموں کی جوانی ہو تم

○

ہم جب چلیں تو یہ جہاں جھومے
آرزو ہماری آسماں چومے

ہم نئے جہاں کے پاسباں
ہم نئی بہار کے رازداں
ہم ہنسیں تو ہنس پڑے ہر کلی
ہم چلیں تو چل پڑے زندگی
سارے نظاروں میں، پھولوں میں تاروں میں ہم نے ہی جادو بھرا

ہم سے فضاؤں میں رنگ و بو
ہم ہیں اس زمیں کی آبرو
ندیوں کی راگنی ہم سے ہے
ہر طرف یہ تازگی ہم سے ہے
سارے نظاروں میں، پھولوں میں تاروں میں ہم نے ہی جادو بھرا

دُور ہوگئیں سبھی مشکلیں!
کھنچ کے پاس آگئیں منزلیں!
دیکھ کر شباب کے حوصلے
خود بخود سمٹ گئے فاصلے
سارے نظاروں میں، پھولوں میں تاروں میں ہم نے ہی جادُو بھرا

○

تم بھی چلو، ہم بھی چلیں، چلتی رہے زندگی
نہ زمیں منزل نہ آسماں، زندگی ہے زندگی

پیچھے دیکھے نہ کبھی مڑ کے راہوں میں!
مجھے میرا دل تمھیں لے کے باہوں میں
دھڑکنوں کی زباں نت کہے داستاں
پیار کی جھلمل چھاؤں میں پلتی رہے زندگی

بہتے چلیں ہم مستی کے دھاروں میں
گونجتے ہی رہیں سدا دل کے تاروں میں
اب رکے نہ کہیں پیار کا کارواں
نت نئی رُت کے ڈھنگ ڈھلتی رہے زندگی

○

ا : نہ تو کارواں کی تلاش ہے، نہ تو ہم سفر کی تلاش ہے
مرے شوقِ خانہ خراب کو تری رہگزر کی تلاش ہے

ب : مرے نامراد جنوں کا ہے علاج کوئی تو موت ہے
جو دوا کے نام پہ زہر دے اُسی چارہ گر کی تلاش ہے

ا : تیرا عشق ہے مری آرزو، تیرا عشق ہے میری آبرو
تیرا عشق کیسے میں چھوڑ دُوں، میری عمر بھر کی تلاش ہے

دل عشق، جسم عشق ہے اور جان عشق ہے
ایمان کی جو پوچھو تو ایمان عشق ہے
تیرا عشق کیسے میں چھوڑ دُوں، میری عمر بھر کی تلاش ہے

پ : وحشتِ دل رسن و دار سے رو کی نہ گئی
کسی خنجر، کسی تلوار سے رو کی نہ گئی
عشق، مجنوں کی وہ آواز ہے جس کے آگے
کوئی لیلیٰ کسی دیوار سے رو کی نہ گئی

---------- یہ عشق عشق ہے

وہ ہنس کے اگر مانگیں تو ہم جان بھی دے دیں
یہ جان تو کیا چیز ہے، ایمان بھی دے دیں
عشق آزاد ہے، ہندو نہ مُسلمان ہے عشق
جس سے آگاہ نہیں شیخ و برہمن دونوں
اس حقیقت کا گرجتا ہوا اعلان ہے عشق
عشق نہ پچھے دین دھرم نوں عشق نہ پچھے ذاتاں
عشق دے ہتھوں گرم لہو وِچ ڈبیاں لکھ براتاں

---------- یہ عشق عشق ہے

جب جب کرشن کی بنسی باجی نکلی رادھا سج کے
جان اجان کا دھیان بھلا کے لوک لاج کو تج کے

بن بن ڈولی جھنک دُلاری پہن کے پریم کی مالا
روشن جل کی پیاسی میرا، پی گئی بِس کا پیالا
——— یہ عشق عشق ہے

اللہ اور رسول کا فرمان عشق ہے
یعنی حدیث عشق ہے قرآن عشق ہے
گوتم کا اور مسیحؑ کا ارمان عشق ہے
یہ کائنات عشق ہے اور جان عشق ہے
عشق سرمدؔ، عشق ہی منصور ہے
عشق موسیٰؑ، عشق کوہِ طُور ہے
خاک کو بُت اور بُت کو دیوتا کرتا ہے عشق
انتہا یہ ہے کہ بندے کو خدا کرتا ہے عشق
انتہا یہ ہے کہ بندے کو خدا کرتا ہے عشق
——— یہ عشق عشق ہے

○

یار ہی میرا کپڑا لتا یار ہی میرا گہنا
یار ملے تو عزت سمجھوں کنجری بن کر رہنا

نی میں یار منانا نی چاہے لوگ بولیاں بولیں
میں تو باز نہ آنا نی چاہے زہر ستونیں گھولیں

مکھڑا اس کا چاند کا ٹکڑا قد سرو کا بوٹا
اس کی بانہہ کا ہر ہر پورا لگتا کانچ ہے ٹوٹا
یار ملے تو جگ کیا کرنا یار بنا جگ سُونا
جگ کے بدلے یار ملے تو یار کا مول دوں دُونا

میں تو نئیں شرمانا نی چاہے لوگ بولیاں بولیں
میں تو سیج سجانا نی چاہے زہر ستونیں گھولیں

تھرک رہی میرے پیر کی جھانجر جھنک رہا میرا چُوڑا
اُڑ اُڑ جائے آنچل میرا کھُل کھُل جائے جُوڑا

بیٹھ اکیلی کرتی تھی میں دیواروں سے باتیں
آج ملا وہ یار تو بس گئیں پھر سے سونی راتیں

میں تو جھُوم ریا نانی چاہے لوگ بولیاں بولیں
نچ کے یار منانا نی چاہے زہر سوتنیں گھولیں

بچھڑے یار نے پھیرا ڈالا پریت سہاگن ہوئی
آج ملی جو دولت اس کا مول نہ جانے کوئی

○

ملتی ہے زندگی میں محبت کبھی کبھی
ہوتی ہے دلبروں کی عنایت کبھی کبھی

شرما کے مُنہ نہ پھیر نظر کے سوال پر
لاتی ہے ایسے موڑ پہ قسمت کبھی کبھی

کُھلتے نہیں ہیں روز دریچے بہار کے
آتی ہے جانِ من یہ قیامت کبھی کبھی

تنہا نہ کٹ سکیں گے جوانی کے راستے
پیش آئے گی کسی کی ضرورت کبھی کبھی

پھر کھو نہ جائیں ہم کہیں دنیا کی بھیڑ میں
ملتی ہے پاس آنے کی مہلت کبھی کبھی

○

سرمئی رات ہے ستارے ہیں
آج دونوں جہاں ہمارے ہیں
صبح کا انتظار کون کرے

پھر یہ رُت، یہ سماں ملے نہ ملے
آرزو کا چمن کھلے نہ کھلے
وقت کا اعتبار کون کرے

لے بھی لو ہم کو اپنی باہوں میں
روح بے چین ہے نگاہوں میں
التجا بار بار کون کرے؟

○

۲

نغمہ و شعر کی سوغات کسے پیش کروں
یہ چھلکتے ہوئے جذبات کسے پیش کروں؟
شوخ آنکھوں کے اُجالوں کو لٹاؤں کس پر
مست زلفوں کی سیہ رات کسے پیش کروں؟
گرم سانسوں میں چھپے راز بتاؤں کس کو
نرم ہونٹوں میں دبی بات کسے پیش کروں؟
کوئی ہمراز تو پاؤں، کوئی ہمدم تو ملے
دل کی دھڑکن کے اشارات کسے پیش کروں؟

○

اپنا دل پیش کروں، اپنی وفا پیش کروں
کچھ سمجھ میں نہیں آتا تجھے کیا پیش کروں

تیرے ملنے کی خوشی میں کوئی نغمہ چھیڑوں
یا ترے دردِ جدائی کا گِلہ پیش کروں

میرے خوابوں میں بھی تُو میرے خیالوں میں بھی تُو
کون سی چیز تجھے تجھ سے جُدا پیش کروں

جو ترے دل کو لبھاتے وہ ادا مجھ میں نہیں
کیوں نہ تجھ کو کوئی تیری ہی ادا پیش کروں

○

سلام حسرت قبول کر لو
مری محبت قبول کر لو

اداس نظریں تڑپ تڑپ کر تمھارے جلووں کو ڈھونڈتی ہیں
جو خواب کی طرح کھو گئے ان حسیں لمحوں کو ڈھونڈتی ہیں
اگر نہ ہو ناگوار تم کو، تو یہ شکایت قبول کر لو!
مری محبت قبول کر لو

تمھی نگاہوں کی آرزو ہو، تمھی خیالوں کا مدعا ہو
تمھی مرے واسطے صنم ہو، تمھی مرے واسطے خدا ہو
مری پرستش کی لاج رکھ لو، مری عبادت قبول کر لو
مری محبت قبول کر لو

تمھاری جھکتی نظر سے جب تک نہ کوئی پیغام مل سکے گا
نہ روح تسکین پا سکے گی نہ دل کو آرام مل سکے گا
غمِ جدائی ہے جان لیوا، یہ اک حقیقت قبول کر لو
مری محبت قبول کر لو

○

بھولے سے محبت کر بیٹھا ، ناداں تھا بچارا ، دل ہی تو ہے
ہر دل سے خطا ہو جاتی ہے ، بگڑو نہ خدارا ، دل ہی تو ہے

اس طرح نگاہیں مت پھیرو ، ایسا نہ ہو دھڑکن رُک جائے
سینے میں کوئی پتھر تو نہیں احساس کا مارا ، دل ہی تو ہے

جذبات بھی ہندو ہوتے ہیں چاہت بھی مسلماں ہوتی ہے
دنیا کا اشارہ تھا لیکن سمجھا نہ اشارہ ، دل ہی تو ہے

بیداد گروں کی ٹھوکر سے ، سب خواب سہانے چور ہوئے
اب دل کا سہارا غم ہی تو ہے ، اب غم کا سہارا دل ہی تو ہے

○

بھول سکتا ہے بھلا کون یہ پیاری آنکھیں
رنگ میں ڈوبی ہوئی نیند سے بھاری آنکھیں

میری ہر سوچ نے، ہر سانس نے چاہا ہے تمہیں
جب سے دیکھا ہے تمہیں، تب سے سراہا ہے تمہیں
بس گئی ہیں مری آنکھوں میں تمہاری آنکھیں

تم جو نظروں کو اٹھاؤ تو ستارے جھک جائیں
تم جو پلکوں کو جھکاؤ تو زمانے رک جائیں
کیوں نہ بن جائیں ان آنکھوں کی پجاری آنکھیں

جاگتی راتوں کو سپنوں کا خزانہ مل جائے
تم جو مل جاؤ تو جینے کا بہانہ مل جائے
اپنی قسمت پہ کریں ناز ہماری آنکھیں

○

یہ بہاروں کا سماں، چاند تاروں کا سماں
کھو نہ جائے، آ بھی جا
آسماں سے رنگ بن کر بہہ رہی ہے چاندنی
بے زبانی کی زباں سے کہہ رہی ہے چاندنی
جاگتی رُت ناگہاں، سو نہ جائے آ بھی جا
رات کے ہمراہ ڈھلتی جا رہی ہے زندگی
شمع کی صورت پگھلتی جا رہی ہے زندگی
روشنی بجھ کر دھُواں ہو نہ جائے آ بھی جا
آ ذرا ہنس کر نگاہوں میں نگاہیں ڈال دے
دیر کی ترسی ہوئی باہوں میں باہیں ڈال دے
حسرتوں کا کارواں کھو نہ جائے آ بھی جا

○

آج سجن موہے انگ لگا لو جنم سپھل ہو جائے
ہردے کی پیڑا، ادیہہ کی اگنی سب شیتل ہو جائے

کیے لاکھ جتن، مورے من کی تپن، مورے تن کی جلن نہیں جائے
کیسی لاگی یہ لگن، کیسی جاگی یہ اگن، جیا دھیر دھرن نہیں پائے
پریم سدھا اتنی برسا دو جگ جل تھل ہو جائے
آج سجن موہے انگ لگا لو جنم سپھل ہو جائے

کئی جگوں سے ہیں جاگے، مورے نین ابھاگے، کہیں جیا نہیں لاگے بن تورے
سکھ دیکھے ناہیں آگے، دکھ پیچھے پیچھے بھاگے، جگ سونا سونا لاگے بن تورے
پریم سدھا اتنی برسا دو جگ جل تھل ہو جائے
آج سجن موہے انگ لگا لو جنم سپھل ہو جائے

موہے اپنا بنا لو، موری بانہہ پکڑ، میں ہوں جنم جنم کی داسی
موری پیاس بجھا دو، منوہر گردھر، میں ہوں انتر گھٹ تک پیاسی
پریم سدھا اتنی برسا دو جگ جل تھل ہو جائے
آج سجن موہے انگ لگا لو، جنم سپھل ہو جائے

○

## دوگانا :

ا : ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر کہ دل ابھی بھرا نہیں

ابھی ابھی تو آئی ہو　　بہار بن کے چھائی ہو
ہوا ذرا مہک تو لے　　نظر ذرا بہک تو لے
یہ شام ڈھل تو لے ذرا　　یہ دل سنبھل تو لے ذرا
میں تھوڑی دیر جی تو لوں　　نشے کے گھونٹ پی تو لوں

ابھی تو کچھ کہا نہیں، ابھی تو کچھ سُنا نہیں

ب : ستارے جھلملا اُٹھے　　چراغ جگمگا اُٹھے
بس اب نہ مجھ کو ٹوکنا　　نہ بڑھ کے راہ روکنا
اگر میں رُک گئی ابھی　　تو جا نہ پاؤں گی کبھی
یہی کہو گے تم سدا　　کہ دل ابھی بھرا نہیں

جو ختم ہو کسی جگہ، یہ ایسا سلسلہ نہیں

ا: ادھوری آس چھوڑ کے ادھوری پیاس چھوڑ کے
جو روز یوں ہی جاؤ گی تو کس طرح نبھاؤ گی؟
کہ زندگی کی راہ میں جواں دلوں کی چاہ میں
کئی مقام آئیں گے جو ہم کو آزمائیں گے
بُرا نہ مانو بات کا، یہ پیار ہے گلہ نہیں

ب: جہاں میں ایسا کون ہے کہ جس کو غم ملا نہیں
دکھ اور سکھ کے راستے بنے ہیں سب کے واسطے
جو غم سے ہار جاؤ گے تو کس طرح نبھاؤ گے
خوشی ملے ہمیں کہ غم جو ہوگا بانٹ لیں گے ہم
مجھے تم آزماؤ تو ذرا نظر ملاؤ تو
یہ جسم دو سہی مگر، دلوں میں فاصلہ نہیں
تمہارے پیار کی قسم تمہارا غم ہے میرا غم
نہ یوں بجھے بجھے رہو جو دل کی بات ہے کہو
جو مجھ سے بھی چھپاؤ گے تو پھر کسے بتاؤ گے
میں کوئی غیر تو نہیں دلاؤں کس طرح یقیں
کہ تم سے میں جُدا نہیں نہ مجھ سے تم جُدا نہیں

○

آج کیوں ہم سے پردہ ہے؟
تیرا ہر رنگ ہم نے دیکھا ہے
تیرا ہر ڈھنگ ہم نے دیکھا ہے
ہاتھ کھیلے ہیں تیری زلفوں سے
آنکھ واقف ہے تیرے جلووں سے
تجھ کو ہر طرح آزمایا ہے
پا کے کھویا ہے کھو کے پایا ہے
انکھڑیوں کا بیاں سمجھتے ہیں
دھڑکنوں کی زباں سمجھتے ہیں
چوڑیوں کی کھنک سے واقف ہیں
چھاگلوں کی چھنک سے واقف ہیں

نازو انداز جانتے ہیں ہم
تیرا ہر راز جانتے ہیں ہم
آج کیوں ہم سے پردہ ہے؟
مُنہ چھپانے سے فائدہ کیا ہے
دل دکھانے سے فائدہ کیا ہے
اُلجھی اُلجھی لٹیں سنوار کے آ
حُسن کو اور بھی نکھار کے آ
نرم گالوں میں بجلیاں لے کر
شوخ آنکھوں میں تتلیاں لے کر
آ بھی جا اب ادا سے لہراتی
ایک دلہن کی طرح شرماتی
تُو نہیں ہے تو رات سونی ہے
عشق کی کائنات سونی ہے
مرنے والوں کی زندگی تُو ہے
اس اندھیرے کی روشنی تُو ہے
آج کیوں ہم سے پردہ ہے؟

آ ترا انتظار کب سے ہے
ہر نظر بے قرار کب سے ہے
شمع رہ رہ کے جھلملاتی ہے
سانس تاروں کی ڈوبی جاتی ہے
تو اگر مہربان ہو جائے
ہر تمنّا جوان ہو جائے
آ بھی جا اب کہ رات جاتی ہے
ایک عاشق کی بات جاتی ہے
خیر ہو تیری زندگانی کی
بھیک دے دے ہمیں جوانی کی
تجھ پہ سو جان سے فدا ہیں ہم
ایک مدّت کے آشنا ہیں ہم
آج کیوں ہم سے پردہ ہے ؟

○

مطلب نکل گیا ہے تو پہچانتے نہیں
یُوں جارہے ہیں جیسے ہمیں جانتے نہیں

اپنی غرض تھی جب تو لپٹنا قبول تھا
بانہوں کے دائرے میں سمٹنا قبول تھا
اب ہم منا رہے ہیں مگر مانتے نہیں

ہم نے تمھیں پسند کیا، کیا بُرا کیا
رُتبہ ہی کچھ بلند کیا، کیا بُرا کیا
ہر اک گلی کی خاک تو ہم چھانتے نہیں

مُنہ پھیر کر نہ جاؤ ہمارے قریب سے
ملتا ہے کوئی چاہنے والا نصیب سے
اس طرح عاشقوں پہ کماں تانتے نہیں

○

مجھے گلے سے لگا لو بہت اُداس ہُوں مَیں
غمِ جہاں سے چُھڑا لو بہت اُداس ہوں مَیں

یہ انتظار کا دُکھ اب سہا نہیں جاتا
تڑپ رہی ہے محبّت رہا نہیں جاتا
تم اپنے پاس بلا لو بہت اُداس ہُوں مَیں

بھٹک چکی ہوں بہت زندگی کی راہوں میں
مجھے اب آ کے چھپا لو تم اپنی باہوں میں
مرا سوال نہ ٹالو بہت اُداس ہُوں مَیں

ہر اک سانس میں ملنے کی پیاس پلتی ہے
سلگ رہا ہے بدن اور روح جلتی ہے
بچا سکو تو بچا لو بہت اُداس ہوں مَیں

○

نیلے گگن کے تلے، دھرتی کا پیار پلے
ایسے ہی جگ میں آتی ہیں صبحیں، ایسے ہی شام ڈھلے
نیلے گگن کے تلے

شبنم کے موتی، پھولوں پہ بکھریں، دونوں کی آس پھلے
بل کھاتی بیلیں، مستی میں کھیلیں، پیڑوں سے مل کے گلے
ندیا کا پانی، دریا سے مل کے، ساگر کی اور چلے
نیلے گگن کے تلے
دھرتی کا پیار پلے

○

کسی پتھر کی مُورت سے محبّت کا ارادہ ہے
پرستش کی تمنّا ہے، عبادت کا ارادہ ہے

جو دل کی دھڑکنیں سمجھے، نہ آنکھوں کی زباں سمجھے
نظر کی گفتگو سمجھے، نہ جذبوں کا بیاں سمجھے
اُسی کے سامنے اُس کی شکایت کا ارادہ ہے

سُنا ہے ہر جواں پتھر کے دل میں آگ ہوتی ہے
مگر جب تک نہ چھیڑو شرم کے پردے میں سوتی ہے
یہ سوچا ہے کہ دل کی بات اس کے رُو برو کر دیں
ہر اک بے جا تکلّف سے بغاوت کا ارادہ ہے

محبّت بے رُخی سے اور بھڑکے گی، وہ کیا جانے
طبیعت اس ادا پر اور پھڑکے گی، وہ کیا جانے
وہ کیا جانے کہ اپنی کس قیامت کا ارادہ ہے

○

## دوگانا:

ا: جو وعدہ کیا وہ نبھانا پڑے گا
رو کے زمانہ چاہے روکے خدائی تم کو آنا پڑے گا
ترستی نگاہوں نے آواز دی ہے
محبت کی راہوں نے آواز دی ہے
جانِ حیا، جانِ ادا، چھوڑو ترسانا، تم کو آنا پڑے گا

ب: یہ مانا ہمیں جاں سے جانا پڑے گا
پر یہ سمجھ لو، تم نے جب بھی پکارا ہم کو آنا پڑے گا
ہم اپنی وفا پر نہ الزام لیں گے
تمہیں دل دیا ہے، تمہیں جاں بھی دیں گے
جب عشق کا سودا کیا، پھر کیا گھبرانا ہم کو آنا پڑے گا

ا : سبھی اہلِ دنیا یہ کہتے ہیں ہم سے

کہ آتا نہیں کوئی مُلکِ عدم سے

آج ذرا، شانِ وفا، دیکھے زمانہ، تم کو آنا پڑے گا

ب : ہم آتے رہے ہیں ہم آتے رہیں گے

محبّت کی رسمیں نبھاتے رہیں گے

جانِ وفا تم دو صدا، پھر کیا ٹھکانا ہم کو آنا پڑے گا

○

تیرے در پہ آیا ہُوں کچھ کر کے جاؤں گا
جھولی بھر کے جاؤں گا یا مَر کے جاؤں گا

تو سب کچھ جانے ہے، ہر غم پہچانے ہے
جو دل کی الجھن ہے سب تجھ پہ روشن ہے
گھایل پروانہ ہُوں، وحشی دیوانہ ہوں

دل غم سے حیراں ہے، میری دنیا ویراں ہے
نظروں کی پیاس بجھا، میرا بچھڑا یار ملا !
اب یہ غم چھوٹے گا، ورنہ دم ٹوٹے گا
اب جینا مشکل ہے، فریادیں لایا ہُوں

○

تم اگر ساتھ دینے کا وعدہ کرو
مَیں یونہی مست نغمے لٹاتا رہوں
تم مجھے دیکھ کر مسکراتی رہو
میں تمھیں دیکھ کر گیت گاتا رہوں

کتنے جلوے فضاؤں میں بکھرے مگر
میں نے اب تک کسی کو پکارا نہیں
تم کو دیکھا تو نظریں یہ کہنے لگیں
ہم کو چہرے سے ہٹنا گوارا نہیں
تم اگر میری نظروں کے آگے رہو
میں ہر اک شے سے نظریں چراتا رہوں

میں نے خوابوں میں برسوں تراشا جسے
تم وہی سنگِ مرمر کی تصویر ہو
تم نہ سمجھو تمھارا مقدر ہوں مَیں
میں سمجھتا ہُوں تم میری تقدیر ہو
تم اگر مجھ کو اپنا سمجھنے لگو
میں بہاروں کی محفل سجاتا رہُوں!

○

جُرمِ اُلفت پہ ہمیں لوگ سزا دیتے ہیں
کیسے نادان ہیں شعلوں کو ہوا دیتے ہیں

ہم سے دیوانے کہیں ترکِ وفا کرتے ہیں
جان جائے کہ رہے بات نبھا کرتے ہیں

آپ دولت کے ترازو میں دلوں کو تولیں
ہم محبت سے محبت کا صلہ دیتے ہیں

تخت کیا چیز ہے اور لعل و جواہر کیا ہیں
عشق والے تو خدائی بھی لُٹا دیتے ہیں

ہم نے دل دے بھی دیا، عہدِ وفا لے بھی لیا
آپ اب شوق سے دے لیں جو سزا دیتے ہیں

○

غم کیوں ہو؟

جینے والوں کو جیتے جی مرنے کا غم کیوں ہو؟
شوخ لبوں پر آہیں کیوں ہوں آنکھوں میں نم کیوں ہو؟
آج اگر گلشن میں کلی کھلتی ہے تو کل مرجھاتی ہے
پھر بھی کُھل کر ہنستی ہے اور ہنس کے چمن مہکاتی ہے
غم کیوں ہو؟

کل کا دن کس نے دیکھا ہے آج کا دن ہم کھوئیں کیوں
جن گھڑیوں میں ہنس سکتے ہیں ان گھڑیوں میں روئیں کیوں
غم کیوں ہو؟

گائے جا مستی کے ترانے، ٹھنڈی آہیں بھرنا کیا؟
موت آئی تو مر بھی لیں گے، موت سے پہلے مرنا کیا؟

O

میں ہر اک پل کا شاعر ہُوں
ہر اک پل میری کہانی ہے
ہر اک پل میری ہستی ہے
ہر اک پل میری جوانی ہے

رشتوں کا روپ بدلتا ہے
بنیادیں ختم نہیں ہوتیں
خوابوں کی اور امنگوں کی
میعادیں ختم نہیں ہوتیں

ہر پھول میں تیرا روپ بسا
ہر پھول میں تیری جوانی ہے
اک چہرہ تیری نشانی ہے
اک چہرہ میری نشانی ہے

تم کو مجھ کو جیون امرت
ان ہاتھوں سے ہی پینا ہے
ان کی دھڑکن میں بسنا ہے
ان کی سانسوں میں جینا ہے
تو اپنی ادائیں بخش انہیں
میں اپنی وفائیں دیتا ہوں
جو اپنے لیے سوچی تھی کبھی
وہ ساری دعائیں دیتا ہوں

○

یُوں تو حُسن ہر جگہ ہے، لیکن اس قدر نہیں
اے وطن کی سرزمیں!
یہ کھُلی کھُلی فضا　　یہ دُھلا دُھلا گگن
ندیوں کے پیچ و خم　　پربتوں کا بانکپن
تیری وادیاں جواں، تیرے راستے حسیں
اے وطن کی سرزمیں!

تیری خاک میں بسی　　ماں کے دُودھ کی مہک
تیرے روپ میں رَچی　　سورگ لوک کی جھلک
ہم میں ہی کمی رہی، تجھ میں کچھ کمی نہیں
اے وطن کی سرزمیں!

نعمتوں کے درمیاں بھوک پیاس کیوں رہے
تیرے پاس کیا نہیں تو اداس کیوں رہے
عام ہوگی وہ خوشی، جو ہے اب کہیں کہیں
اے وطن کی سرزمین!

تیری خاک کی قسم ہم تجھے سجائیں گے
ہر چھپا ہوا ہنر روشنی میں لائیں گے
آنے والے دَور کی برکتوں پہ رکھ یقیں
اے وطن کی سرزمیں!

○

ساتھی ہاتھ بڑھانا

ایک اکیلا تھک جائے گا مل کر بوجھ اٹھانا
ــــــــ ساتھی ہاتھ بڑھانا

ہم محنت والوں نے جب بھی مل کر قدم بڑھایا
ساگر نے رستہ چھوڑا پربت نے سیس جھکایا
فولادی ہیں سینے اپنے فولادی ہیں باہیں
ہم چاہیں تو پیدا کر دیں چٹانوں میں راہیں
ــــــــ ساتھی ہاتھ بڑھانا

محنت اپنے لیکھ کی ریکھا محنت سے کیا ڈرنا
کل غیروں کی خاطر کی آج اپنی خاطر کرنا
اپنا دکھ بھی ایک ہے ساتھی اپنا سکھ بھی ایک
اپنی منزل، سچ کی منزل، اپنا رستہ نیک
ــــــــ ساتھی ہاتھ بڑھانا

ایک سے ایک ملے تو قطرہ بن جاتا ہے دریا
ایک سے ایک ملے تو ذرّہ بن جاتا ہے صحرا
ایک سے ایک ملے تو رائی بن سکتی ہے پربت
ایک سے ایک ملے تو انساں بس میں کرلے قسمت

ساتھی ہاتھ بڑھانا ——

ماٹی سے ہم لال نکالیں موتی لائیں جل سے
جو کچھ اس دنیا میں بنا ہے بنا ہمارے بل سے
کب تک محنت کے پیروں میں دولت کی زنجیریں
ہاتھ بڑھا کر چھین لو اپنے خوابوں کی تعبیریں

ساتھی ہاتھ بڑھانا ——

O

یہ دیش ہے ویر جوانوں کا
البیلوں کا مستانوں کا
اس دیش کا یارو کیا کہنا
یہ دیش ہے دُنیا کا گہنا

یہاں چوڑی چھاتی ویروں کی
یہاں گوری شکلیں ہیروں کی
یہاں گاتے ہیں رانجھے مستی میں
مچتی ہیں دھومیں بستی میں

پیڑوں پہ بہاریں جھولوں کی
راہوں میں قطاریں پھولوں کی
یہاں ہنستا ہے ساون بالوں میں
کھلتی ہیں کلیاں گالوں میں

کہیں دنگل شوخ جوانوں کے
کہیں کرتب تیر کمانوں کے
یہاں نِت نِت میلے سجتے ہیں
نت ڈھول اور تاشے بجتے ہیں

دِلبر کے لیے دلدار ہیں ہم
دشمن کے لیے تلوار ہیں ہم
میداں میں اگر ہم ڈٹ جائیں
مشکل ہے کہ پیچھے ہٹ جائیں

O

دھرتی ماں کا مان، ہمارا پیارا لال نشان
توگ کی مسکان، ہمارا پیارا لال نشان

پونجی واد سے دب نہ سکے گا، یہ مزدور کسان کا جھنڈا
محنت کا حق لے کے رہے گا، محنت کش انسان کا جھنڈا
یودھا اور بلوان ہمارا، ہمارا پیارا لال نشان
اس جھنڈے سے سانس اکھڑتی چور منافع خوروں کی
جنھوں نے انسانوں کی حالت کر دی ڈنگر ڈھوروں کی
ان کے خلاف اعلان ہمارا، ہمارا پیارا لال نشان
فیکٹریوں کے دھول دھوئیں میں ہم نے خود کو پالا
خون پلا کر لوہے کو اس دیش کا بھار سنبھالا
محنت کے اس 'پوجا گھر' پہ پڑ نہ سکے گا تالا
دیش کے سادھن، دیش کا دھن ہیں جان لے پونجی والا
جیتے گا میدان، ہمارا پیارا لال نشان
دھرتی ماں کا مان، ہمارا پیارا لال نشان

○

وہ صبح کبھی تو آئے گی

ان کالی صدیوں کے سر سے، جب رات کا آنچل ڈھلکے گا
جب دُکھ کے بادل پگھلیں گے، جب سکھ کا ساگر چھلکے گا
جب امبر جھوم کے ناچے گا، جب دھرتی نغمے گائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی

جس صبح کی خاطر جُگ جُگ سے، ہم سب مر مر کر جیتے ہیں
جس صبح کے امرت کی دھُن میں ہم زہر کے پیالے پیتے ہیں
ان بھوکی پیاسی روحوں پر اک دن تو کرم فرمائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی

مانا کہ ابھی تیرے میرے ارمانوں کی قیمت کچھ بھی نہیں
مٹی کا بھی ہے کچھ مول مگر انسانوں کی قیمت کچھ بھی نہیں
انسانوں کی عزت جب جھوٹے سِکّوں میں نہ تولی جائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی

دولت کے لیے جب عورت کی عصمت کو نہ بیچا جائے گا
چاہت کو نہ کُچلا جائے گا، غیرت کو نہ بیچا جائے گا
اپنے کالے کرتُوتوں پر جب یہ دُنیا شرمائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی

بیتیں گے کبھی تو دن آخر یہ بھوک کے اور بیکاری کے
ٹوٹیں گے کبھی تو بُت آخر دولت کی اجارہ داری کے
جب ایک انوکھی دُنیا کی بنیاد اٹھائی جائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی

مجبور بڑھاپا جب سُونی راہوں کی دُھول نہ پھانکے گا
معصوم لڑکپن جب گندی گلیوں میں بھیک نہ مانگے گا
حق مانگنے والوں کو جس دن سُولی نہ دکھائی جائے گی
وُہ صبح کبھی تو آئے گی

فاقوں کی چتاؤں پر جس دن انساں نہ جلائے جائیں گے
سینوں کے دہکتے دوزخ میں ارماں نہ جلائے جائیں گے
یہ نرک سے بھی گندی دنیا، جب سورگ بنائی جائے گی
وُہ صبح کبھی تو آئے گی

# ۲

وہ صبح ہمیں سے آئے گی

جب دھرتی کروٹ بدلے گی، جب قید سے قیدی چھوٹیں گے
جب پاپ گھروندے پھوٹیں گے، جب ظلم کے بندھن ٹوٹیں گے
اُس صبح کو ہم ہی لائیں گے، وہ صبح ہمیں سے آئے گی

وہ صبح ہمیں سے آئے گی

منحوس سماجی ڈھانچوں میں جب ظُلم نہ پالے جائیں گے
جب ہاتھ نہ کاٹے جائیں گے، جب سر نہ اُچھالے جائیں گے
جیلوں کے بِنا جب دُنیا کی سرکار چلائی جائے گی !

وہ صبح ہمیں سے آئے گی

سنسار کے سارے محنت کش کھیتوں سے مِلوں سے نکلیں گے
بے گھر، بے دَر، بے بس انساں تاریک بِلوں سے نکلیں گے
دُنیا امن اور خوشحالی کے پھولوں سے سجائی جائے گی

وہ صبح ہمیں سے آئے گی

○

رات کے راہی تھک مت جانا، صبح کی منزل دُور نہیں

دھرتی کے پھیلے آنگن میں پل دو پل ہے رات کا ڈیرا
ظُلم کا سینہ چیر کے دیکھو، جھانک رہا ہے نیا سویرا
ڈھلتا دن مجبور سہی، چڑھتا سورج مجبور نہیں

صدیوں تک چُپ رہنے والے اب اپنا حق لے کے رہیں گے
جو کرنا ہے کُھل کے کریں گے جو کہنا ہے صاف کہیں گے
جیتے جی گُھٹ گُھٹ کر مرنا اس یُگ کا دستور نہیں

ٹُوٹیں گی بوجھل زنجیریں، جاگیں گی سوتی تقدیریں
لُوٹ پہ کب تک پہرا دیں گی زنگ لگی خونیں زنجیریں
رہ نہیں سکتا اس دنیا میں جو سب کو منظور نہیں

○

رات بھر کا ہے مہماں اندھیرا
کس کے روکے رُکا ہے سویرا

رات جتنی بھی سنگین ہو گی
صبح اتنی ہی رنگین ہو گی
غم نہ کر گر ہے بادل گھنیرا
کس کے روکے رُکا ہے سویرا

لب پہ شکوہ نہ لا، اشک پی لے
جس طرح بھی ہو کچھ دیر جی لے
اب اُکھڑنے کو ہے غم کا ڈیرا
کس کے روکے رُکا ہے سویرا

یوں ہی دنیا میں آ کر نہ جانا
صرف آنسو بہا کر نہ جانا
مسکراہٹ پہ بھی حق ہے تیرا
کس کے روکے رُکا ہے سویرا

○

اب کوئی گلشن نہ اُجڑے اب وطن آزاد ہے
رُوح گنگا کی ہمالہ کا بدن آزاد ہے

کھیتیاں سونا اگائیں، وادیاں موتی لٹائیں
آج گوتم کی زمیں، تلُسی کا بَن آزاد ہے

مندروں میں سنکھ باجے مسجدوں میں ہو اذاں
شیخ کا دَھرم اور دین برہمن آزاد ہے

لوٹ کیسی بھی ہو اب اس دیش میں رہنے نہ پائے
آج سب کے واسطے دھرتی کا دھن آزاد ہے

○

زور لگا کے ــــــ ہیّا
پیر جما کے ــــــ ہیّا
جان لڑا کے ــــــ ہیّا

آنگن میں بیٹھی ہے مچھیرن تیری آس لگائے
ارمانوں اور آشاؤں کے لاکھوں دیپ جلائے
بھولا پن رستہ دیکھے ، ممتا خیر منائے
زور لگا کر کھینچ مچھیرے ڈھیل نہ آنے پائے
ــــــ ہیّا ہیّا
زور لگا کے ــــــ ہیّا
پیر جما کے ــــــ ہیّا
جان لڑا کے ــــــ ہیّا

جنم جنم سے اپنے سر پہ طوفانوں کے سائے
لہریں اپنی ہمجولی ہیں اور بادل ہمسائے
جل اور جال ہیں جیون اپنا، کیا سردی کیا گرمی
اپنی ہمت کبھی نہ ٹوٹے، رُت آئے رُت جائے

ہیّا ہیّا ——
زور لگا کے —— ہیّا
پیر جما کے —— ہیّا
جان لڑا کے —— ہیّا

کیا جانے کب ساگر اُمڈے کب برکھا آ جائے
بھوک سروں پر منڈلائے مُنہ کھولے، پَر پھیلائے
آج بِلا سو اپنی پونجی، کل کی ہاتھ پرائے
تنی ہوئی باہوں سے کہہ دو، لوچ نہ آنے پائے

ہیّا ہیّا ——
زور لگا کے —— ہیّا
پیر جما کے —— ہیّا
جان لڑا کے —— ہیّا

○

آپ نہ جانے مجھ کو سمجھتے ہیں کیا؟
میں تو کچھ بھی نہیں
اس قدر پیار اتنی بڑی بھیڑ کا
میں رکھوں گا کہاں؟
اس قدر پیار رکھنے کے قابل نہیں
میرا دل میری جاں
مجھ کو اتنی محبّت نہ دو دوستو
سوچ لو دوستو!
اس قدر پیار کیسے نبھاؤں گا میں
میں تو کچھ بھی نہیں

عزّتیں، شہرتیں، چاہتیں، اُلفتیں
کوئی بھی چیز دنیا میں رہتی نہیں
آج میں ہُوں جہاں کل کوئی اور تھا
یہ بھی اک دَور ہے وہ بھی اک دَور تھا

آج اتنی محبّت نہ دو دوستو
کہ میرے کل کی خاطر نہ کچھ بھی بچے
آج کا پیار تھوڑا بچا کر رکھو
میرے کل کے لیے

کل جو گمنام ہے، کل جو سنسان ہے،
کل جو انجان ہے، کل جو ویران ہے
میں تو کچھ بھی نہیں
میں تو کچھ بھی نہیں

○

رنگ اور نُور کی بارات کسے پیش کروں
یہ مرادوں کی حسیں رات کسے پیش کروں

میں نے جذبات نبھائے ہیں اصولوں کی جگہ
اپنے ارمان پرو لایا ہوں پھولوں کی جگہ
تیرے سہرے کی یہ سوغات کسے پیش کروں

یہ میرے شعر، مرے آخری نذرانے ہیں
میں اُن اپنوں میں ہوں جو آج سے بیگانے ہیں
بے تعلق سی ملاقات کسے پیش کروں

سُرخ جوڑے کی تب و تاب مبارک ہو تجھے
تیری آنکھوں کا نیا خواب مبارک ہو تجھے
میں یہ خواہش یہ خیالات کسے پیش کروں

کون کہتا ہے کہ چاہت یہ سبھی کا حق ہے
تو جسے چاہے ترا پیار اسی کا حق ہے
مجھ سے کہہ دے میں ترا ہات کسے پیش کروں

○

چھُو لینے دو نازک ہونٹوں کو، کچھ اور نہیں ہے جام ہے یہ
قدرت نے جو ہم کو بخشا ہے وہ سب سے حسیں انعام ہے یہ
شرما کے نہ یونہی کھو دینا رنگین جوانی کی گھڑیاں
بے تاب دھڑکتے سینوں کا ارمان بھرا پیغام ہے یہ
اچھوں کو بُرا ثابت کرنا دنیا کی پرانی عادت ہے
اس مے کو مبارک چیز سمجھ مانا کہ بہت بدنام ہے یہ

○

یہ رات یہ چاندنی پھر کہاں
سُن جا دل کی داستاں

پیڑوں کی شاخوں پہ سوئی سوئی چاندنی
تیرے خیالوں میں کھوئی کھوئی چاندنی
اور تھوڑی دیر میں تھک کے لوٹ جائے گی
رات یہ بہار کی پھر کبھی نہ آئے گی
دو ایک پل اور ہے یہ سماں
سُن جا دل کی داستاں

لہروں کے ہونٹوں پہ دھیما دھیما راگ ہے
بھیگی ہواؤں میں ٹھنڈی ٹھنڈی آگ ہے
اس حسین آگ میں تو بھی جل کے دیکھ لے
زندگی کے گیت کی دُھن بدل کے دیکھ لے
کھلنے دے اب دھڑکنوں کی زباں

جاتی بہاریں ہیں اُٹھتی جوانیاں
تاروں کی چھاؤں میں کہہ لے کہانیاں
ایک بار چل دیے گر تجھے پکار کے
لوٹ کے نہ آئیں گے قافلے بہار کے
آجا ابھی زندگی ہے جواں
سُن جا دل کی داستاں!

○

تم اپنا رنج و غم، اپنی پریشانی مجھے دے دو
تمھیں غم کی قسم، اس دل کی ویرانی مجھے دے دو

یہ مانا میں کسی قابل نہیں ہوں ان نگاہوں میں
بُرا کیا ہے اگر یہ دُکھ، یہ حیرانی مجھے دے دو

میں دیکھوں تو سہی، دنیا تمھیں کیسے ستاتی ہے
کوئی دن کے لیے اپنی نگہبانی مجھے دے دو

وہ دل جو میں نے مانگا تھا مگر غیروں نے پایا ہے
بڑی شے ہے اگر اس کی پشیمانی مجھے دے دو

○

پونچھ کر اشک اپنی آنکھوں سے مسکراؤ تو کوئی بات بنے
سر جھکانے سے کچھ نہیں ہوتا سر اٹھاؤ تو کوئی بات بنے

زندگی بھیک میں نہیں ملتی زندگی بڑھ کے چھینی جاتی ہے
اپنا حق سنگ دل زمانے سے چھین پاؤ تو کوئی بات بنے

رنگ اور نسل ذات اور مذہب جو بھی ہے آدمی سے کمتر ہے
اس حقیقت کو تم بھی میری طرح مان جاؤ تو کوئی بات بنے

نفرتوں کے جہان میں ہم کو پیار کی بستیاں بسانی ہیں
دور رہنا کوئی کمال نہیں، پاس آؤ تو کوئی بات بنے

○

میں جاگوں ساری رین سجن تم سو جاؤ
گیتوں میں چھپا لوں بین سجن تم سو جاؤ

شام ڈھلے سے بھور بھئے تک، جاگ کے جب کٹتی ہے گھڑیاں
مدھر ملن کی اوس میں بس کر، کھلتی ہیں جب جیون کی کلیاں
آج نہیں وہ رین سجن تم سو جاؤ

پھیکی پڑ گئی چاند کی جیوتی، دھندلے پڑ گئے دیپ گگن کے
سو گئیں سندر سیج کی کلیاں، سو گئے کھلتے بھاگ دلہن کے
کھل کر رو لیں نین سجن تم سو جاؤ

جاگ کے تن کی اگنی سو گئی، بڑھ کے تھم گئی من کی ہلچل
اپنا گھونگھٹ آپ الٹ کر، کھول دی میں نے پاؤں کی پایل
اب ہے چین ہی چین، سجن تم سو جاؤ

○

ہر طرف حُسن ہے جوانی ہے
آج کی رات کیا سہانی ہے
ریشمی جسم سرسراتے ہیں
مَرمریں خواب گنگناتے ہیں

دھڑکنوں میں سرور پھیلا ہے
رنگ نزدیک و دور پھیلا ہے

دعوتِ عشق دے رہی ہے فضا
آج ہو جا کسی حسیں پہ فدا
محبت بڑے کام کی چیز ہے

محبت کے دم سے ہے دنیا کی رونق
محبت نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا
نظر اور دل کی پناہوں کی چھوٹی
یہ جنت نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا

کتابوں میں چھپتے ہیں چاہت کے قصے
حقیقت کی دنیا میں چاہت نہیں ہے

زمانے کے بازار میں یہ وہ شے ہے
کہ جس کی کسی کو ضرورت نہیں ہے
یہ بے کار بے دام کی چیز ہے
محبت بڑے کام کی چیز ہے

یہ بس نام ہی نام کی چیز ہے

محبت سے اتنا خفا ہونے والے
چل آ آج تجھ کو محبت سکھا دیں
ترا دل جو برسوں سے ویراں پڑا ہے
کسی نازنیناں کو اس میں بسا دیں
میرا مشورہ کام کی چیز ہے

○

نہیں کیا تو کر کے دیکھ
تو بھی کسی پہ مر کے دیکھ
حُسن کے بکھرے پھولوں سے
دل کی جھولی بھر کے دیکھ

کون تجھے کیا کہتا ہے
کیوں اُس کا غم سہتا ہے
کُتّے بھونکتے رہتے ہیں
قافلہ چلتا رہتا ہے
کبھی اپنے من کی کر کے دیکھ!

رہتیں رسمیں توڑ بھی دے
دل کو اکیلا چھوڑ بھی دے

دنیا دل کی دشمن ہے
دنیا کا مُنہ موڑ بھی دے
کچھ تو انوکھا کر کے دیکھ!

ایک رستہ ہے دولت کا
دوسرا عیش و عشرت کا
تیسرا جھوٹی عزت کا
چوتھا سچی اُلفت کا
اس رستے سے گزر کے دیکھ!

○

غیروں پہ کرم اپنوں پہ سِتم
اے جانِ وفا یہ ظُلم نہ کر
رہنے دے ابھی تھوڑا سا بھرم
اے جانِ وفا یہ ظُلم نہ کر

ہم چاہنے والے ہیں تیرے
یوں ہم کو جلانا ٹھیک نہیں
محفل میں تماشا بن جائیں
اس طرح جلانا ٹھیک نہیں
مر جائیں گے ہم مٹ جائیں گے ہم
اے جانِ وفا یہ ظلم نہ کر

ہم بھی تھے ترے منظورِ نظر
دل چاہے تو اب انکار نہ کر
سَو تیر چلا سینے پہ مگر!
بیگانوں سے مِل کے وار نہ کر
تجھ کو تری بے دردی کی قسم
اے جانِ وفا یہ ظلم نہ کر!

○

تم اگر مجھ کو نہ چاہو تو کوئی بات نہیں
تم کسی اور کو چاہو گی تو مشکل ہو گی!

اب اگر میل نہیں ہے تو جدائی بھی نہیں
بات توڑی بھی نہیں تم نے نبھائی بھی نہیں
یہ سہارا ہی بہت ہے مرے جینے کے لیے
تم اگر میری نہیں ہو تو پرائی بھی نہیں
میرے دل کو نہ سراہو تو کوئی بات نہیں
غیر کے دل کو سراہو گی تو مشکل ہو گی!

تم حسیں ہو تمھیں سب پیار ہی کرتے ہونگے
میں جو مرتا ہوں تو کیا اور بھی مرتے ہونگے
سب کی آنکھوں میں اسی شوق کا طوفاں ہوگا
سب کے سینے میں یہی درد ابھرتے ہونگے
میرے غم میں نہ کراہو تو کوئی بات نہیں
اور کے غم میں کراہو گی تو مشکل ہو گی!

پھول کی طرح ہنسو سب کی نگاہوں میں رہو
اپنی معصوم جوانی کی پناہوں میں رہو
مجھ کو وہ دن نہ دکھانا تمھیں اپنی ہی قسم
میں ترستا رہوں تم غیر کی باہوں میں رہو

تم جو مجھ سے نہ نباہو تو کوئی بات نہیں
کسی دشمن سے نباہو گی تو مشکل ہوگی

○

چلو اِک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں!

نہ میں تُم سے کوئی اُمید رکھوں دل نوازی کی
نہ تم میری طرف دیکھو غلط انداز نظروں سے
نہ میرے دل کی دھڑکن لڑکھڑائے میری باتوں سے
نہ ظاہر ہو تمھاری کشمکش کا راز نظروں سے

تمھیں بھی کوئی اُلجھن روکتی ہے پیش قدمی سے
مجھے بھی لوگ کہتے ہیں کہ یہ جلوے پرائے ہیں
مرے ہمراہ بھی رسوائیاں ہیں میرے ماضی کی
تمھارے ساتھ بھی گزری ہوئی راتوں کے سائے ہیں

تعارف روگ ہو جائے تو اس کو بھولنا بہتر
تعلق بوجھ بن جائے تو اس کو توڑنا اچھا
وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن
اسے ایک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا

○

اس جانِ دو عالم کا جلوہ
پردے میں بھی ہے بے پردہ بھی ہے
مشتاق نگاہوں کا کعبہ
پردے میں بھی ہے بے پردہ بھی ہے

بے چین رہے عاشق کی نظر
تھوڑی سی مگر تسکین بھی ہو
اُس پردہ نشیں کا یہ منشا !
پردے میں بھی ہے بے پردہ بھی ہے

کیا حُسنِ زمیں کیا رنگِ فلک
سب اُس کے کرشمے کی ہے جھلک

تاروں میں بسا ہے نُور اُس کا
پھولوں میں بسا ہے رنگ اس کا
یہ روپ میں شامل روپ اس کا
یہ ڈھنگ میں شامل ڈھنگ اس کا
اوّل بھی وہی آخر بھی وہی
اوجھل بھی وہی ظاہر بھی وہی
منصور وہی سرمد بھی وہی
لاحد بھی وہی اور حد بھی وہی
شعلہ بھی وہی شبنم بھی وہی
سچ یہ ہے کہ ہیں خود ہم بھی وہی
مخلوق سے خالق کا رشتہ
پردے میں بھی ہے بے پردہ بھی ہے

وہ مالکِ کُل، محبوب مرا
سنتا ہے ہر اک دھڑکن کی صدا
جب اس کا اشارہ ہوتا ہے
تقدیر سنورنے لگتی ہے

مُدّت سے ترستے خوابوں کی
تعبیر اُبھرنے لگتی ہے
سجدے میں جھکا کر سَر اپنا
مانگے جو کبھی انسان دُعا
ہو جاتی ہے ہر مشکل آساں
مِل جاتی ہے دردِ دِل کی دُعا
ہے اس کی یہ خاص الخاص دُعا
پردے میں بھی ہے بے پردہ بھی ہے

○

جو ہم میں ہے وہ متوالی ادا سب میں نہیں ہوتی
محبت سب میں ہوتی ہے وفا سب میں نہیں ہوتی

ایسے ویسے ٹھکانوں پہ جانا بُرا ہے
بچ کے رہنا مری جاں یہ زمانہ بُرا ہے

زُلف لہرائے تو زنجیر بھی بن جاتی ہے
آنکھ شرمائے تو اک تیر بھی بن جاتی ہے
دل لبھانے کو جو دلدار بنا کرتے ہیں
دل پہ جُرا کہ وہی تلوار بنا کرتے ہیں
یہ وہ محفل ہے جہاں پیار بھی لُٹ جاتا ہے
دل تو کیا چیز ہے گھر بار بھی لٹ جاتا ہے
اسی لیے تو کہتی ہوں ـــــــ
ایسے ویسے ٹھکانوں پہ جانا بُرا ہے!

تک کے ہنستے ہیں تو مستانہ بنا دیتے ہیں
اور ہنس کے تکتے ہیں تو دیوانہ بنا دیتے ہیں
کوئی نغموں میں کوئی ساز میں کھو جاتا ہے
ان سے جو بچتا ہے وہ ناز میں کھو جاتا ہے
یوں تو گر ان سے لپٹ جاتی ہیں باہیں اُن کی
اسی لیے تو کہتی ہوں ——
ایسے ویسے ٹھکانوں پہ جانا بُرا ہے!

ہم ستم ڈھاتے ہیں بیداد کیا کرتے ہیں
دل لیا کرتے ہیں اور درد دیا کرتے ہیں
دُور رہنا ہو تو محفل مری آباد کرو
ورنہ جاؤ جی کسی اور کو برباد کرو
آج جاؤ گے تو کل لوٹ کے پھر آؤ گے
ہم سا معشوق نہ دنیا میں کہیں پاؤ گے
اسی لیے تو کہتی ہوں ——
ایسے ویسے ٹھکانوں پہ جانا بُرا ہے!

O

ہر طرح کے جذبات کا اعلان ہیں آنکھیں
شبنم کبھی شعلہ کبھی طوفان ہیں آنکھیں

آنکھوں سے بڑی کوئی ترازو نہیں ہوتی
تُلتا ہے بشر جس میں وہ میزان ہیں آنکھیں

آنکھیں ہی ملاتی ہیں زمانے میں دلوں کو
انجان ہیں ہم تم، اگر انجان ہیں آنکھیں

لب کچھ بھی کہیں اس سے حقیقت نہیں کھلتی
انسان کے سچ جھوٹ کی پہچان ہیں آنکھیں

آنکھیں نہ جھکیں تیری کسی غیر کے آگے
دنیا میں بڑی چیز مری جان! ہیں آنکھیں

○

جیو تو ایسے جیو جیسے سب تمہارا ہے
مَرو تو ایسے کہ جیسے تمہارا کچھ بھی نہیں!

یہ ایک راز کہ دُنیا نہ جس کو جان سکی
یہی وہ راز ہے جو زندگی کا حاصل ہے
تمھیں کہو تمھیں یہ بات کیسے سمجھاؤں
کہ زندگی کی گھٹن زندگی کی قاتل ہے
ہر اک نگاہ کو قدرت کا یہ اشارہ ہے

جہاں میں آ کے جہاں سے کھنچے کھنچے نہ رہو
وہ زندگی ہی نہیں جس میں آس بجھ جائے
کوئی بھی پیاس دبائے سے دب نہیں سکتی
اسی سے چین ملے گا کہ پیاس بجھ جائے
یہ کہہ کے مُڑتا ہوا زندگی کا دھارا ہے!

یہ آسماں یہ زمیں، یہ فضا یہ نظارے
ترس رہے ہیں تمھاری مری نظر کے لیے
نظر چُرا کے ہر اک شے کو یوں نہ ٹھکراؤ
کوئی شریکِ سفر ڈھونڈ لو سفر کے لیے
بہت قریب سے میں نے تمھیں پکارا ہے!

○

پگھلی آگ سے ساغر بھر لے
کل مرنا ہے، آج ہی مر لے
اب نہ کبھی یہ رات ڈھلے گی، اب نہ کبھی جاگے گا سویرا
سوچ ہے کس کی، فکر ہے کس کی، اس دنیا میں کون ہے تیرا
کوئی نہیں جو تیری خبر لے
پگھلی آگ سے ساغر بھر لے

قدرت اندھی، دنیا بہری
کالے پڑ گئے، خواب سنہری
توڑ بھی دے اب خواب کا رشتہ، چھوڑ بھی دے جذبات سے لڑنا
آج نہیں تو کل سمجھے گا مشکل ہے حالات سے لڑنا
جو حالات کرائیں کر لے
پگھلی آگ سے ساغر بھر لے

بند ہے نیکی کا دروازہ
آپ اُٹھا لے اپنا جنازہ

کوئی نہیں جو بوجھ اٹھائے اپنی زندہ لاشوں کا
ختم ہی کر دے آج فسانہ، ان بے درد تماشوں کا
جانِ تمنا، جاں سے گزر لے
پگھلی آگ سے ساغر بھر لے

○

موت کبھی بھی مل سکتی ہے، لیکن جیون کل نہ ملے گا
مرنے والے سوچ سمجھ لے پھر تجھ کو یہ پل نہ ملے گا

کون سا ایسا دل ہے جہاں میں جس کو غم کا روگ نہیں
کون سا ایسا گھر ہے جس میں سُکھ ہی سکھ ہے سوگ نہیں
جو حل دُنیا بھر کو ملا ہے، کیوں تجھ کو وہ حل نہ ملے گا
مرنے والے سوچ سمجھ لے پھر تجھ کو یہ پل نہ ملے گا

اس جیون میں کتنے ہی دکھ ہوں لیکن سُکھ کی آس تو ہے
دل میں کوئی ارمان بسا ہے، آنکھ میں کوئی پیاس تو ہے
جیون نے یہ پھل تو دیا ہے، موت سے یہ بھی پھل نہ ملے گا
مرنے والے سوچ سمجھ لے، پھر تجھ کو یہ پل نہ ملے گا

○

بانٹ کے کھاؤ، اس دنیا میں، بانٹ کے بوجھ اٹھاؤ
جس رستے میں سب کا سکھ ہو وہ رستہ اپناؤ
اس تعلیم سے بڑھ کر جگ میں کوئی نہیں تعلیم
کہہ گئے فادر ابراہیم!

کُتّے سے کیا بدلہ لینا گر کُتّے نے کاٹا
تم نے گر کتّے کو کاٹا، کیا تجھ کا کیا چاٹا
تم انسان ہو یارو، اپنی کچھ تو کرو تعظیم
کہہ گئے فادر ابراہیم!

جھوٹ کے سر پر تاج بھی ہو تو جھوٹ کا بھانڈا پھوڑو
سچ چاہے سولی چڑھوا دے، سچ کا ساتھ نہ چھوڑو
کل وہ سچ امرت ہوگا جو آج ہے کڑوا نیم!
کہہ گئے فادر ابراہیم!

○

تورا مَن درپن کہلائے ـــــــ

بھلے بُرے سارے کرموں کو دیکھے اور دکھائے

مَن ہی دیوتا، من ہی ایشور، مَن سے بڑا نہ کوئے
من اجیارا جب جب پھیلے، جگ اُجیارا ہوئے
جگ سے چاہے بھاگ لے کوئی من سے بھاگ نہ پائے

سُکھ کی کلیاں دُکھ کے کانٹے من سب کا آدھار
مَن سے کوئی بات چھُپے نا مَن کے نین ہزار
جگ سے چاہے بھاگ لے کوئی من سے بھاگ نہ پائے

تن کی دولت ڈھلتی چھایا، من کا دھن انمول
تن کے کارن من کے دھن کو مت ماٹی میں رول
من کی قدر بھلانے والا، ہیرا جنم گنوائے

○

اے دل زباں نہ کھول صرف دیکھ لے
کسی سے کچھ نہ بول، صرف دیکھ لے

یہ حسین جگمگاہٹیں　　آنچلوں کی سرسراہٹیں
یہ نشے میں جھومتی زمیں　　سب کے پاؤں چومتی زمیں
کس قدر ہے گول صرف دیکھ لے
اے دل زباں نہ کھول صرف دیکھ لے

کتنا سچ ہے کتنا جھوٹ ہے　　کتنا حق ہے کتنی لوٹ ہے
رکھ سبھی کی لاج کچھ نہ کہہ　　کیا ہے یہ سماج کچھ نہ کہہ
ڈھول کا یہ پول صرف دیکھ لے
اے دل زباں نہ کھول صرف دیکھ لے

مان لے جہاں کی بات کو　　دن سمجھ لے کالی رات کو
چلنے دے یونہی یہ سلسلہ　　یہ نہ بول کس کو کیا ملا
ترازو کا جھول، صرف دیکھ لے
اے دل زباں نہ کھول صرف دیکھ لے

○

من رے، تو کاہے نہ دِھیر دھرے
وہ نرموہی موہ نہ جانیں، جن کا موہ کرے
من رے، تُو کاہے نہ دھیر دھرے

اس جیون کی چڑھتی ڈھلتی دھوپ کو کس نے باندھا
رنگ پہ کس نے پہرے ڈالے، روپ کو کس نے باندھا
کاہے یہ جتن کرے
من رے، تُو کاہے نہ دھیر دھرے

اُتنا ہی اپکار سمجھ، کوئی جتنا ساتھ نبھا دے
جنم مرن کا میل ہے سپنا، یہ سپنا بسرا دے
کوئی نہ سنگ مرے
من رے، تو کاہے نہ دھیر دھرے

○

تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنا لے
اپنے پہ بھروسا ہے تو یہ داؤ لگا لے
ڈرتا ہے زمانے کی نگاہوں سے بھلا کیوں
انصاف ترے ساتھ ہے الزام اٹھا لے
کیا خاک وہ جینا ہے جو اپنے ہی لیے ہو
خود مِٹ کے کسی اور کو مِٹنے سے بچا لے
ٹوٹے ہوئے پتوار ہیں کشتی کے تو غم کیا؟
ہاری ہوئی باہوں کو ہی پتوار بنا لے

○

کل جہاں بستی تھیں خوشیاں آج ہے ماتم وہاں
وقت لایا تھا بہاریں، وقت لایا ہے خزاں

وقت سے دن اور رات، وقت سے کل اور آج
وقت کی ہر شے غلام، وقت کا ہر شے پہ راج

وقت کے آگے اُڑی کتنی تہذیبوں کی دُھول
وقت کے آگے مٹے کتنے مذہب اور رواج

وقت کی گردش سے ہے چاند تاروں کا نظام
وقت کی ٹھوکر میں ہیں کیا حکومت کیا سماج

وقت کی پابند ہیں آتی جاتی رونقیں!
وقت ہے پھولوں کی سیج، وقت ہے کانٹوں کا تاج

آدمی کو چاہیے، وقت سے ڈر کر رہے!
کون جانے کس گھڑی وقت کا بدلے مِزاج

○

اپنے اندر ذرا جھانک میرے وطن
اپنے عیبوں کو مت ڈھانک میرے وطن

تیرا اتہاس ہے خوں میں لتھڑا ہوا
تُو ابھی تک ہے دنیا میں بچھڑا ہوا
تُو نے اپنوں کو اپنا نہ مانا کبھی
تُو نے انساں کو انسان نہ جانا کبھی
تیرے دھرموں نے ذاتوں کی تقسیم کی
تری رسموں نے نفرت کی تعلیم دی
وحشتوں کا چلن تجھ میں جاری رہا
قتل و خوں کا جنوں تجھ پہ طاری رہا
اپنے اندر ذرا جھانک میرے وطن!

تو دراوڑ ہے یا آریہ نسل ہے
جو بھی ہے اب اسی خاک کی فصل ہے
رنگ اور نسل کے دائرے سے نکل
گر چکا ہے بہت دیر اب تو سنبھل
تیرے دل سے جو نفرت نہ مٹ پائے گی
تیرے گھر میں غلامی پلٹ آئے گی
تیری بربادیوں کا تجھے واسطہ
ڈھونڈ اپنے لیے اب نیا راستہ
اپنے اندر ذرا جھانک میرے وطن!
اپنے عیبوں کو مت ڈھانک میرے وطن!

○

تم چلی جاؤ گی، پرچھائیاں رہ جائیں گی
کچھ نہ کچھ حُسن کی رعنائیاں رہ جائیں گی

تم کہ اس جھیل کے ساحل پہ ملی ہو مجُھ سے
جب بھی دیکھوں گا یہیں مجھ کو نظر آؤ گی
یاد مٹتی ہے نہ منظر کوئی مٹ سکتا ہے
دُور جاکر بھی تم اپنے کو یہیں پاؤ گی

گھُس کے رہ جاتے گی جھونکوں میں بدن کی خوشبو
زلف کا عکس گھٹاؤں میں رہے گا صدیوں
پھول چپکے سے چرالیں گے لبوں کی سُرخی
یہ جواں حُسن فضاؤں میں رہے گا صدیوں

اس دھڑکتی ہوئی شاداب و حسیں وادی میں
یہ نہ سمجھو کہ ذرا دیر کا قصہ ہو تم!
اب ہمیشہ کے لیے میرے مقدر کی طرح
ان نظاروں کے مقدّر کا بھی حصہ ہو تم!

تم چلی جاؤ گی پرچھائیاں رہ جائیں گی
کچھ نہ کچھ حسن کی رعنائیاں رہ جائیں گی

○

سانجھ کی لالی سُلگ سُلگ کر بن گئی کالی دُھول
آئے نہ بالم بیدردی، میں چُنتی رہ گئی پھول

رین بھئی، بوجھل اکھین میں چُبھنے لاگے تارے
دیس میں میں پردیسن ہو گئی جب سے پیا سدھارے

پچھلے پہر جب اوس پڑی اور ٹھنڈی پون چلی
ہر کروٹ انگارے بجھ گئے، سونی سیج جلی

دیپ بجھے، سناٹا ٹوٹا، باجا بھور کا سنکھ
بیرن پون اُڑا کر لے گئی، پروانوں کے پنکھ

○

میں جب بھی اکیلی ہوتی ہوں تم چپکے سے آجاتے ہو
اور جھانک کے میری آنکھوں میں بیتے دن یاد دلاتے ہو

مستانہ ہوا کے جھونکوں سے ہر بار وہ پردے کا ہلنا
پردے کو پکڑنے کی دھن میں دو اجنبی ہاتھوں کا مِلنا
آنکھوں میں دُھواں سا چھا جانا سانسوں میں ستارے سے کھِلنا

رستے میں تمہارا مُڑ مُڑ کر تکنا وہ مجھے جاتے جاتے
اور میرا ٹھٹھک کر رُک جانا، چلمن کے قریب آتے آتے
نظروں کا ترس کر رہ جانا، اک اور جھلک پانے پاتے

بالوں کو سکھانے کی خاطر، کوٹھے پہ وہ میرا آجانا
اور تم کو مقابل پاتے ہی کچھ شرمانا، کچھ بل کھانا
ہمسایوں کے ڈر سے کترانا، گھر والوں کے ڈر سے گھبرانا

رو رو کے تمہیں خط لکھتی ہوں، اور خود پڑھ کر رو لیتی ہوں
حالات کے تپتے طوفاں میں جذبات کی کشتی کھیتی ہوں
کیسے ہو، کہاں ہو کچھ تو کہو، میں تم کو صدائیں دیتی ہوں

میں جب بھی اکیلی ہوتی ہوں، تم چپکے سے آجاتے ہو
اور جھانک کے میری آنکھوں میں بیتے دن یاد دلاتے ہو

○

آنکھ کھُلتے ہی تم چھُپ گئے ہو کہاں
تم ابھی تھے یہاں

میرے پہلو میں تاروں نے دیکھا تمھیں
بھیگے بھیگے نظاروں نے دیکھا تمھیں
تم کو دیکھا کیے یہ زمیں آسماں
تمُ ابھی تھے یہاں

ابھی سانسوں کی خوشبو ہواؤں میں ہے
ابھی قدموں کی آہٹ فضاؤں میں ہے
ابھی شاخوں میں ہیں انگلیوں کے نشاں
تم ابھی تھے یہاں

تم جُدا ہو کے بھی میری راہوں میں ہو
گرم اشکوں میں ہو سرد آہوں میں ہو
چاندنی میں جھلکتی ہیں پرچھائیاں
تم ابھی تھے یہاں

○

برباد محبت کی دُعا ساتھ لیے جا
ٹوٹا ہوا اقرارِ وفا ساتھ لیے جا

اِک دل تھا جو پہلے ہی تجھے سونپ دیا تھا
یہ جان بھی اے جانِ ادا ساتھ لیے جا

تپتی ہوئی راہوں سے تجھے آنچ نہ پہنچے
دیوانوں کے اشکوں کی گھٹا ساتھ لیے جا

شامل ہے مرا خونِ جگر تیری حِنا میں
یہ کم ہو تو اب خونِ وفا ساتھ لیے جا

ہم جرمِ محبت کی سزا پائیں گے تنہا
جو تجھ سے ہوئی ہو وہ خطا ساتھ لیے جا

○

ہم انتظار کریں گے ترا قیامت تک
خدا کرے کہ قیامت ہو اور تُو آئے

یہ انتظار بھی اِک امتحان ہوتا ہے
اسی سے عشق کا شعلہ جوان ہوتا ہے
یہ انتظار سلامت ہو اور تُو آئے!

بچھائے شوق کے سجدے وفا کی راہوں میں
کھڑے ہیں دید کی حسرت لیے نگاہوں میں
قبولِ دل کی عبادت ہو اور تُو آئے

وہ خوش نصیب ہے جس کو تُو انتخاب کرے
خُدا ہماری محبّت کو کامیاب کرے
جواں ستارۂ قسمت ہو اور تُو آئے
خدا کرے کہ قیامت ہو اور تُو آئے

O

اتنی حسین اتنی جواں رات کیا کریں
جاگے ہیں کچھ عجیب سے جذبات کیا کریں

پیڑوں کے بازوؤں میں مہکتی ہے چاندنی
بے چین ہو رہے ہیں خیالات کیا کریں

سانسوں میں گھل رہی ہے کسی سانس کی مہک
دامن کو چھو رہا ہے کوئی ہاتھ کیا کریں

شاید تمہارے آنے سے یہ بھید کھل سکے
حیران ہیں کہ آج نئی بات کیا کریں؟

○

جو بات تجھ میں ہے تری تصویر میں نہیں!

رنگوں میں تیرا عکس ڈھلا، تو نہ ڈھل سکی
سانسوں کی آگ جسم کی خوشبو نہ ڈھل سکی
تجھ میں جو لوچ ہے مری تحریر میں نہیں

بے جان حُسن میں کہاں گفتار کی اَدا
انکار کی ادا ہے نہ اقرار کی اَدا
کوئی لچک بھی زلفِ گرہ گیر میں نہیں

دُنیا میں کوئی چیز نہیں ہے تری طرح
پھر ایک بار سامنے آجا کسی طرح
کیا اور اک جھلک مری تقدیر میں نہیں؟

○

ہر چیز زمانے کی جہاں پہ تھی وہیں ہے
اِک تو ہی نہیں ہے

نظریں بھی وہی اور نظارے بھی وہیں ہیں
خاموش فضاؤں کے اشارے بھی وہیں ہیں
کہنے کو تو سب کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں ہے

ہر اشک میں کھوئی ہوئی خوشیوں کی جھلک ہے
ہر سانس میں بیتی ہوئی گھڑیوں کی کسک ہے
تو چاہے کہیں بھی ہو، ترا درد یہیں ہے

حسرت نہیں، ارمان نہیں، آس نہیں ہے
یادوں کے سوا کچھ بھی مرے پاس نہیں ہے
یادیں بھی رہیں یا نہ رہیں کس کو یقیں ہے

○

زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات
ایک انجان حسینہ سے ملاقات کی رات

ہائے وہ ریشمیں زلفوں سے برستا پانی
پھول سے گالوں پہ رُکنے کو ترستا پانی
دل میں طوفان اٹھائے ہوئے جذبات کی رات
زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات

ڈر کے بجلی سے اچانک وہ لپٹنا اُس کا
اور پھر شرم سے بل کھا کے سمٹنا اُس کا
کبھی دیکھی نہ سُنی ایسی طلسمات کی رات
زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات

سُرخ آنچل کو دبا کر جو نچوڑا اُس نے
دل پہ جلتا ہوا اک تیر سا چھوڑا اُس نے
آگ پانی میں لگاتے ہوئے حالات کی رات
زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات

میرے نغموں میں جو بستی ہے، وہ تصویر تھی وُہ
نوجوانی کے حسیں خواب کی تعبیر تھی وُہ
آسمانوں سے اُتر آئی تھی جو رات کی رات
زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات

○

میں نے شاید تمھیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے
اجنبی سی ہو مگر غیر نہیں لگتی ہو
وہم سے بھی جو ہو نازک وہ یقیں لگتی ہو
ہائے یہ پھول سا چہرہ یہ گھنیری زلفیں
میرے شعروں سے بھی تم مجھ کو حسیں لگتی ہو
میں نے شاید تمھیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے

دیکھ کر تم کو کسی رات کی یاد آتی ہے
ایک خاموش ملاقات کی یاد آتی ہے
ذہن میں حسن کی ٹھنڈک کا اثر جاگتا ہے
آنچ دیتی ہوئی برسات کی یاد آتی ہے
میں نے شاید تمھیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے
میری آنکھوں پہ جھکی رہتی تھیں پلکیں جس کی
تم وہی میرے خیالوں کی پری ہو کہ نہیں
کہیں پہلے کی طرح پھر تو نہ کھو جاؤ گی
جو ہمیشہ کے لیے ہو وہ خوشی ہو کہ نہیں
میں نے شاید تمھیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے!

○

یہ وادیاں، یہ فضائیں بلا رہی ہیں تمھیں
خموشیوں کی صدائیں بلا رہی ہیں تمھیں

ترس رہے ہیں جواں پھول ہونٹ چھونے کو
مچل مچل کے ہوائیں بلا رہی ہیں تمھیں

تمھاری زلفوں سے خوشبو کی بھیک لینے کو
جھکی جھکی سی گھٹائیں بلا رہی ہیں تمھیں

حسین چمپئی پیروں کو جب سے دیکھا ہے
ندی کی مست ادائیں بلا رہی ہیں تمھیں

میرا کہا نہ سنو، ان کی بات تو سُن لو
ہر ایک دل کی دعائیں بلا رہی ہیں تمھیں

○

آپ آئے تو خیالِ دلِ ناشاد آیا
کتنے بھولے ہوئے زخموں کا پتا یاد آیا

آپ کے لب پہ کبھی اپنا بھی نام آیا تھا
شوخ نظروں سے محبّت کا سلام آیا تھا
عُمر بھر ساتھ نبھانے کا پیام آیا تھا
آپ کو دیکھ کے وہ عہدِ وفا یاد آیا

رُوح میں جل اُٹھے بجھتی ہوئی یادوں کے دِیے
کیسے دیوانے تھے ہم آپ کو پانے کے لیے
یُوں تو کچھ کم نہیں جو آپ نے احسان کیے
پر جو مانگے سے نہ پایا وہ صلہ یاد آیا

آج وہ بات نہیں پھر بھی کوئی بات تو ہے
میرے حصّے میں یہ ہلکی سی ملاقات تو ہے
غیر کا ہو کے بھی یہ حسن مرے ساتھ تو ہے
ہائے کس وقت مجھے کب کا گِلہ یاد آیا

○

میں یہ کہتی ہوں کہ کس روز حضور آئیں گے
دل یہ کہتا ہے کہ اک دن وہ ضرور آئیں گے
انتظار اور ابھی ، اور ابھی ، اور ابھی

سانس کی لالی سُلگ سُلگ کر بن گئی کالی دُھول
آئے نہ بالم بے دردی بیں چُنتی رہ گئی پھُول
انتظار اور ابھی ، اور ابھی ، اور ابھی

رین گئی بوجھل اکھیین میں چبھنے لاگے تارے!
دیس میں مَیں پردیسن ہو گئی جب سے پیا سدھارے!
انتظار اور ابھی ، اور ابھی ، اور ابھی

بھور بھئی پر کوئی نہ آیا سونی سیج سجانے
تارے ڈوبے ، دیپک بُجھ گئے ، راکھ ہوئے پروانے
انتظار اور ابھی ، اور ابھی ، اور ابھی

○

آج رونا پڑا تو سمجھے
ہنسنے کا مول کیا ہے اپنا
سپنا کھونا پڑا تو سمجھے

خوابوں کی حقیقت کیا تھی
ارمانوں کی قیمت کیا تھی
اپنوں کی محبّت کیا تھی
غیر ہونا پڑا تو سمجھے

سکھ ملتا ہے کس مشکل سے
کیا کہتی ہے دنیا دل سے
اس رنگ بھری محفل سے
دُور ہونا پڑا تو سمجھے

نکلے تھے جنہیں اپنانے
وہ لوگ تھے سب بیگانے
اس بات کو ہم دیوانے
چین کھونا پڑا تو سمجھے

آج رونا پڑا تو سمجھے!
ہنسنے کا مول کیا ہے اپنا
سپنا کھونا پڑا تو سمجھے

# دو شعر

کس کو خبر تھی، کس کو یقیں تھا ایسے بھی دن آئیں گے
جینا بھی مشکل ہو گا، اور مرنے بھی نہ پائیں گے

ہم جیسے برباد دلوں کا جینا کیا، اور مرنا کیا
آج تری محفل سے اُٹھے، کل دُنیا سے اُٹھ جائیں گے

○

کھلے گگن کے نیچے پنچھی گھومیں ڈالی ڈالی
میں کیا جانوں اُڑنا کیا ہے۔ میں پنجرے کی پالی

گملے کے اس پھول کا جیون، میری کتھا سنائے
اس کے اندر کھلے بچارا، اسی میں مُرجھا جائے

شیشے کے تابوت میں جیسے مچھلی ماتھا پٹکے
پتھر کے اس بندی گھر میں، میری آتما بھٹکے

○

رات بھی ہے کچھ بھیگی بھیگی
چاند بھی ہے کچھ مدّھم مدّھم
تم آؤ تو آنکھیں کھولے
سوئی ہوئی پایل کی چھم چھم
کس کو بتائیں کیسے بتائیں
آج عجب ہے دل کا عالم
چین بھی ہے کچھ ہلکا ہلکا
درد بھی ہے کچھ مدّھم مدّھم

تپتے دل پر یوں گرتی ہے
تیری نظر سے پیار کی شبنم
جلتے ہوئے جنگل پر جیسے
برکھا برسے رُک رُک تھم تھم
ہوش میں تھوڑی بے ہوشی ہے
بے ہوشی میں ہوش ہے کم کم
تجھ کو پانے کی کوشش میں
دونوں جہاں سے کھوئے گئے ہم

○

جسے تُو قبول کرلے وہ ادا کہاں سے لاؤں
ترے دل کو جو لبھائے وہ صدا کہاں سے لاؤں

میں وہ پھول ہوں کہ جس کو گیا ہر کوئی مَسل کے
مری عُمر بہہ گئی ہے مرے آنسوؤں میں ڈھل کے
جو بہار بن کے برسے وہ گھٹا کہاں سے لاؤں

تجھے اور کی تمنّا مجھے تیری آرزو ہے
ترے دل میں غم ہی غم ہے مرے دل میں تُو ہی تُو ہے
جو دلوں کو چین دے دے وہ دوا کہاں سے لاؤں؟

مری بے بسی ہے ظاہر مری آہِ بے اثر سے
کبھی موت بھی جو مانگی تو نہ پائی اس کے در سے
جو مراد لے کے آئے وہ دُعا کہاں سے لاؤں؟

○

اُلجھن سُلجھے نہ، رستہ سوجھے نہ
جاؤں کہاں میں جاؤں کہاں؟

مرے دل کا اندھیرا ہوا اور گھنیرا
کچھ سمجھ نہ پاؤں کیا ہونا ہے میرا
کھڑی دوراہے پر
یہ پوچھوں گھبرا کر
جاؤں کہاں مَیں جاؤں کہاں؟

وہ سانجھ بھی آئے، تن چیر کے جائے
اس حال میں کوئی کس طرح نبھائے
نہ مرنا راس آیا
نہ جینا مَن بھایا
جاؤں کہاں میں جاؤں کہاں؟

بہت کی تدبیریں، نہ ٹوٹی زنجیریں
رت غم کی مٹے نہ، کوئی آس پھلے نہ
تقدیر کے آگے، مری پیش چلے نہ
جاؤں کہاں میں جاؤں کہاں؟

○

کیا دیکھا او نینوں والی نیناں کیوں بھر آئے ؟
کوکھ بھری اور گود ہو خالی نیناں یوں بھر آئے ؟

ماں بن کر بھی ماں نہ بنی مَیں بدنامی کے ڈر سے
دودھ مرے بوجھل سینے کا آنسو بن کر برسے
اپنا دھن اور آپ سوالی نیناں کیوں بھر آئے ؟

جی بھی سکی تو جیتے جی یہ سوگ رہے گا مجھ کو
بولے گا جب میرا مُنّا ماں نہ کہے گا مجھ کو
ماں کہلانا بن گیا گالی نیناں یوں بھر آئے !

○

جب بھی جی چاہے نئی دُنیا بسا لیتے ہیں لوگ
ایک چہرے پر کئی چہرے لگا لیتے ہیں لوگ

یاد رہتا ہے کسے گزرے زمانے کا چلن
سرد پڑ جاتی ہے چاہت، ہار جاتی ہے لگن
اب محبّت بھی ہے کیا
اک تجارت کے سوا
ہم ہی ناداں تھے جو اوڑھا بیتی یادوں کا کفن
ورنہ جینے کے لیے سب کچھ بھلا لیتے ہیں لوگ

جانے وہ کیا لوگ تھے جن کو وفا کا پاس تھا
دوسرے کے دل پہ کیا گذرے گی یہ احساس تھا
اب ہیں پتھر کے صنم
جن کو احساس نہ غم
وہ زمانہ اب کہاں جو اہلِ دل کو راس تھا
اب تو مطلب کے لیے نامِ وفا لیتے ہیں لوگ

○

جائیں تو جائیں کہاں

سمجھے گا کون یہاں، درد بھرے دل کی زباں
جائیں تو جائیں کہاں

مایوسیوں کا مجمع ہے جی میں
کیا رہ گیا ہے اس زندگی میں
روح میں غم، دل میں دُھواں
جائیں تو جائیں کہاں

اُن کا بھی غم ہے، اپنا بھی غم ہے
اب دِل کے بچنے کی اُمید کم ہے
ایک کشتی، سَو طوفاں
جائیں تو جائیں کہاں

○

انھیں کھو کر دُکھے دل کی دعا سے اور کیا مانگوں
میں حیراں ہوں کہ آج اپنی وفا سے اور کیا مانگوں

گریباں چاک ہے، آنکھوں میں آنسو لب پہ آہیں ہیں
یہی کافی ہے دنیا کی ہوا سے اور کیا مانگوں

مری بربادیوں کی داستاں ان تک پہنچ جائے
سوا اس کی محبت کے خدا سے اور کیا مانگوں

○

تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے
ہم بھری دنیا میں تنہا ہو گئے

موت بھی آتی نہیں
آس بھی جاتی نہیں
دل کو یہ کیا ہو گیا
کوئی شے بھاتی نہیں
لُوٹ کر میرا جہاں چھُپ گئے ہو تم کہاں؟

ایک جاں اور لاکھ غم
گھٹ کے رہ جائے نہ دم
آؤ! تم کو دیکھ لیں
ڈوبتی نظروں سے ہم
لُوٹ کر میرا جہاں، چھُپ گئے ہو تم کہاں؟

O

کبھی خود پہ کبھی حالات پہ رونا آیا
بات نکلی تو ہر اک بات پہ رونا آیا

ہم تو سمجھے تھے کہ ہم بھول گئے ہیں اُن کو
کیا ہوا آج یہ کس بات پہ رونا آیا

کس لیے جیتے ہیں ہم کس کے لیے جیتے ہیں
بارہا ایسے سوالات پہ رونا آیا

کوئی روتا ہے کسی اور کی خاطر اے دوست!
سب کو اپنی ہی کسی بات پہ رونا آیا

○

اشکوں میں جو پایا ہے وہ گیتوں میں دیا ہے
اس پر بھی سُنا ہے کہ زمانے کو گِلہ ہے

جو تار سے نکلی ہے وہ دُھن سب نے سُنی ہے
جو ساز پہ گزری ہے وہ کس دل کو پتا ہے

ہم پھول ہیں اوروں کے لیے لائے ہیں خوشبو
اپنے لیے لے دے کے بس اک داغ ملا ہے!

○

میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی
مجھ کو راتوں کی سیاہی کے سوا کچھ نہ ملا

میں وہ نغمہ ہوں جسے پیار کی محفل نہ ملی
وہ مسافر ہوں جسے کوئی بھی منزل نہ ملی
زخم پائے ہیں، بہاروں کی تمنّا کی تھی
میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی

کسی گیسو، کسی آنچل کا سہارا بھی نہیں
راستے میں کوئی دھندلا سا ستارہ بھی نہیں
میری نظروں نے نظاروں کی تمنا کی تھی
میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی

دل میں ناکام اُمیدوں کے بسیرے پائے
روشنی لینے کو نکلا تو اندھیرے پائے
رنگ اور نُور کے دھاروں کی تمنّا کی تھی
میں نے چاند اور ستاروں کی تمنّا کی تھی

میری راہوں سے جُدا ہوگئیں راہیں اُن کی
آج بدلی نظر آتی ہیں نگاہیں اُن کی
جن سے اس دل نے سہاروں کی تمنا کی تھی
میں نے چاند اور ستاروں کی تمنّا کی تھی

پیار مانگا تو سِسکتے ہوئے ارمان ملے
چین چاہا تو اُمڈتے ہوئے طوفان مِلے
ڈوبتے دل نے کناروں کی تمنا کی تھی
میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی

○

بُجھا دیے ہیں خود اپنے ہاتھوں محبتوں کے دیے جلا کے
مِری وفا نے اجاڑ دی ہیں اُمید کی بستیاں بسا کے

تُجھے بھلا دیں گے اپنے دل سے، یہ فیصلہ تو کیا ہے لیکن
نہ دل کو معلوم ہے نہ ہم کو، جییں گے کیسے تجھے بھلا کے

کبھی ملیں گے جو راستے میں تو مُنہ پھرا کر پلٹ پڑیں گے
کہیں سُنیں گے جو نام تیرا تو چُپ رہیں گے نظر جھکا کے

نہ سوچنے پر بھی سوچتی ہوں کہ زندگانی میں کیا رہے گا؟
تری تمنّا کو دفن کر کے ترے خیالوں سے دُور جا کے

○

تری دنیا میں جینے سے تو بہتر ہے کہ مر جائیں
وہی آنسو، وہی آہیں، وہی غم ہے جدھر جائیں

کوئی تو ایسا گھر ہوتا جہاں سے پیار مل جاتا
وہی بیگانے چہرے ہیں جہاں جائیں جدھر جائیں

ارے او آسماں والے بتا اِس میں بُرا کیا ہے
خوشی کے چار جھونکے گر ادھر سے بھی گزر جائیں!

○

تنگ آ چکے ہیں کشمکشِ زندگی سے ہم
ٹھکرا نہ دیں جہاں کو کہیں بے دلی سے ہم

لو! آج ہم نے توڑ دیا رشتۂ اُمید
لو! اب کبھی گلہ نہ کریں گے کسی سے ہم

گر زندگی میں مل گئے پھر اتفاق سے
پوچھیں گے اپنا حال تری بےبسی سے ہم

اَو آسمان والے! کبھی تو نگاہ کر
کب تک یہ ظلم سہتے رہیں خامشی سے ہم؟

○

لو اپنا جہاں دنیا والو
ہم اس دنیا کو چھوڑ چلے
جو رشتے ناتے جوڑے تھے
وہ رشتے ناتے توڑ چلے

کچھ سُکھ کے سپنے دیکھ چلے
کچھ دکھ کے صدمے جھیل چلے
تقدیر کی اندھی گردش نے
جو کھیل کھلائے کھیل چلے
ہر چیز تمہیں لوٹا دی ہے
ہم لے کے نہیں کچھ ساتھ چلے
پھر دوش نہ دینا اے لوگو
ہمیں دیکھ لو خالی ہاتھ چلے

یہ راہ اکیلی کٹتی چلے
یہاں ساتھ نہ کوئی یار چلے
اُس پار نہ جانے کیا پائیں
اس پار تو سب کچھ ہار چلے

○

میں پَل دو پَل کا شاعر ہُوں
پَل دو پَل میری کہانی ہے
پَل دو پَل میری ہستی ہے
پَل دو پَل میری جوانی ہے

مجھ سے پہلے کتنے شاعر
آئے اور آ کر چلے گئے
کچھ آہیں بھر کر لوٹ گئے
کچھ نغمے گا کر چلے گئے
وہ بھی اک پَل کا قصّہ تھے
میں بھی اک پَل کا قصّہ ہوں
کل تم سے جُدا ہو جاؤں گا
گو آج تمھارا حصّہ ہُوں
میں پَل دو پَل کا شاعر ہُوں

کل اور آئیں گے نغموں کی
کھلتی کلیاں چُننے والے
مُجھ سے بہتر کہنے والے
تم سے بہتر سننے والے
کیوں مجھ کو کوئی یاد کرے
مصروف زمانہ میرے لیے
کیوں وقت اپنا برباد کرے؟

میں پَل دو پَل کا شاعر ہوں
پَل دو پل میری جوانی ہے

○

دو بوندیں ساون کی ــــــــ

اِک ساگر کی سیپ میں ٹپکے اور موتی بن جاتے
دُوجی گندے جل میں گِر کر اپنا آپ گنوائے
کس کو مجرم سمجھے کوئی، کس کو دوش لگائے
دو بوندیں ساون کی

دو کلیاں گلشن کی ــــــــ

اِک سہرے کے بیچ گندھے اور من ہی من اترائے
اِک ارتھی کی بھینٹ چڑھے اور دھولی میں مل جائے
کس کو مجرم سمجھے کوئی، کس کو دوش لگائے
دو کلیاں گلشن کی

دو سکھیاں بچپن کی ــــــــ

اک سنگھاسن پر بیٹھے، اور روپ متی کہلائے
دُوجی اپنے روپ کے کارن، گلیوں میں بِک جائے
کس کو مجرم سمجھے کوئی، کس کو دوش لگائے
دو سکھیاں بچپن کی

○

کوئی دل کی چاہت سے مجبور ہے
جو بھی ہے وہ ضرورت سے مجبور ہے
کوئی مانے نہ مانے مگر جانِ من
کچھ تمھیں چاہیے کچھ ہمیں چاہیے

چھُپ کے تکتے ہو کیوں سامنے آؤ جی
ہم تمھارے ہیں ہم سے نہ شرماؤ جی
یہ نہ سمجھو کہ ہم کو خبر کچھ نہیں
سب اِدھر ہی اِدھر ہے اُدھر کچھ نہیں
تم بھی بے چین ہو ہم بھی بے تاب ہیں
جب سے آنکھیں ملیں دونوں بے خواب ہیں

عشق اور مشک چھپتے نہیں ہیں کبھی
اس حقیقت سے واقف ہیں ہم تم سبھی
اپنے دل کی لگی کو چھپاتے ہو کیوں
یہ محبت کی گھڑیاں گنواتے ہو کیوں
پیاس بجھتی نہیں ہے نظارے بِنا
عُمر کٹتی نہیں ہے سہارے بِنا

کوئی مانے نہ مانے مگر جانِ مَن
کچھ تمھیں چاہیے کچھ ہمیں چاہیے!

○

جانے وہ کیسے لوگ تھے جن کے پیار کو پیار ملا
ہم نے تو جب کلیاں مانگیں، کانٹوں کا ہار ملا

خوشیوں کی منزل ڈھونڈی تو غم کی گرد ملی
چاہت کے نغمے چاہے تو آہِ سرد ملی
دل کے بوجھ کو دُونا کر گیا جو غم خوار ملا

بچھڑ گیا ہر ساتھی دے کر پل دو پل کا ساتھ
کس کو فرصت ہے جو تھامے دیوانوں کا ہاتھ
ہم کو اپنا سایہ تک اکثر بیزار ملا

اس کو ہی جینا کہتے ہیں تو یوں ہی جی لیں گے
اُف نہ کریں گے، لب سی لیں گے، آنسو پی لیں گے
غم سے اب گھبرانا کیسا، غم سو بار ملا

○

آسماں پہ ہے خدا اور زمیں پہ ہم
آج کل وہ اس طرف دیکھتا ہے کم

آج کل کسی کو وہ ٹوکتا نہیں
چاہے کچھ بھی کیجیے روکتا نہیں
ہو رہی ہے لوٹ مار، پھٹ رہے ہیں بم
آسماں پہ ہے خدا اور زمیں پہ ہم

کس کو بھیجے وہ یہاں خاک چھاننے
اس تمام بھیڑ کا حال جاننے
آدمی ہیں بے شمار دیوتا ہیں کم
آسماں پہ ہے خدا اور زمیں پہ ہم

اتنی دور سے اگر دیکھتا بھی ہو
تیرے میرے واسطے کیا کرے گا وہ
زندگی ہے اپنے اپنے بازوؤں کا دم
آسماں پہ ہے خدا اور زمیں پہ ہم

○

ان اُجلے محلوں کے تلے
ہم گندی گلیوں میں پلے

سو سو بوجھے من پہ لیے
میل اور ماٹی تن پہ لیے
دکھ سہتے، غم کھاتے رہے
پھر بھی ہنستے گاتے رہے
ہم دیپک طوفاں میں جلے
ہم گندی گلیوں میں پلے

دنیا نے ٹھکرایا ہمیں
رستوں نے اپنایا ہمیں
سڑکیں ماں، سڑکیں ہی پتا
سڑکیں گھر، سڑکیں ہی چِتا
کیوں آئے کیا کر کے چلے
ہم گندی گلیوں میں پلے

دل میں کھٹکا کچھ بھی نہیں
ہم کو پروا کچھ بھی نہیں
چاہو تو ناکارہ کہو
چاہو تو آوارہ کہو
ہم ہی بُرے تم سب ہو بھلے
ہم گندی گلیوں میں پلے

○

محفل سے اُٹھ جانے والو! تم لوگوں پر کیا الزام
تم آباد گھروں کے باسی ہیں آوارہ اور بدنام
میرے ساتھی خالی جام

دو دن تم نے پیار جتایا دو دن تم سے میل رہا
اچھا خاصا وقت کٹا اور اچھا خاصا کھیل رہا
اب اس کھیل کا ذکر ہی کیا کہ وقت کٹا اور کھیل تمام
میرے ساتھی خالی جام

تم نے ڈھونڈی سکھ کی دولت میں نے پالا غم کا روگ
کیسے بنتا کیسے نبھتا یہ رشتہ اور یہ سنجوگ
میں نے دل کو دل سے تولا تم نے مانگے پیار کے دام
میرے ساتھی خالی جام

تم دُنیا کو بہتر سمجھے، میں پاگل تھا خوار ہُوا
تم کو اپنانے نکلا تھا خود سے بھی بیزار ہُوا
دیکھ لیا گھر پھونک تماشا، جان لیا میں نے انجام
میرے ساتھی خالی جام

○

تم نے کتنے سپنے دیکھے، میں نے کتنے گیت بُنے
اس دنیا کے شور میں لیکن دل کی دھڑکن کون سُنے

سرگم کی آواز پہ سر کو دُھننے والے لاکھوں پائے
نغموں کی کھلتی کلیوں کو چننے والے لاکھوں پائے
راکھ ہوا دل جن میں جل کر وہ انگارے کون چُنے
تم نے کتنے سپنے دیکھے میں نے کتنے گیت بُنے

ارمانوں کے سونے گھر میں ہر آہٹ بیگانی نکلی
دل نے جب نزدیک سے دیکھا ہر صورت انجانی نکلی
بوجھل گھڑیاں گنتے گنتے صدمے ہو گئے لاکھ گُنے
تم نے کتنے سپنے دیکھے، میں نے کتنے گیت بُنے

○

دیکھا ہے زندگی کو کچھ اتنا قریب سے
چہرے تمام لگنے لگے ہیں عجیب سے

کہنے کو دل کی بات جنھیں ڈھونڈتے تھے ہم
محفل میں آ گئے ہیں وہ اپنے نصیب سے

نیلام ہو رہا تھا کسی نازنیں کا پیار
قیمت نہیں چکائی گئی اک غریب سے

تیری وفا کی لاش پہ لا میں ہی ڈال دوں
ریشم کا یہ کفن جو ملا ہے رقیب سے

○

سنبھل اے دل، تڑپنے اور تڑپانے سے کیا ہو گا
جہاں بسنا نہیں ممکن وہاں جانے سے کیا ہو گا

چلے آؤ کہ اب مُنہ پھیر کر جانے سے کیا ہو گا
جو تم پر مر مٹا، اس دل کو تڑپانے سے کیا ہو گا

ہمیں سنسار میں اپنا بنانا کون چاہے گا؟
یہ مسلے پھول سیجوں پر سجانا کون چاہے گا؟
تمنّاؤں کو جھوٹے خواب دکھلانے سے کیا ہو گا

تمھیں دیکھا تمھیں چاہا تمھیں پوجا ہے اس دل نے
جو سچ پوچھو تو پہلی بار کچھ مانگا ہے اس دل نے
سمجھتے بوجھتے انجان بن جانے سے کیا ہو گا

جنھیں ملتی ہیں خوشیاں وہ مقدّر اور ہوتے ہیں
جو دل میں گھر بناتے ہیں وہ دلبر اور ہوتے ہیں
اُمیدوں کو کھلونے دے کے بہلانے سے کیا ہوگا

بہت دن سے تھی دل میں اب زباں تک بات پہنچی ہے
وہیں تک اس کو رہنے دو جہاں تک بات پہنچی ہے
جو دل کی آخری حد ہے وہاں تک بات پہنچی ہے
جسے کھونا یقینی ہو اسے پانے سے کیا ہوگا

○

نہ تُو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
ترا وجود ہے اب صرف داستاں کے لیے

پلٹ کے سوئے چمن دیکھنے سے کیا ہوگا
وہ شاخ ہی نہ رہی جو تھی آشیاں کے لیے

غرض پرست جہاں میں وفا تلاش نہ کر
یہ شے بنی تھی کسی دوسرے جہاں کے لیے

○

وفا کے نام پہ کتنے گناہ ہوتے ہیں
گر اُن سے پوچھے کوئی جو تباہ ہوتے ہیں

دامن میں داغ لگا بیٹھے
ہم پیار میں دھوکا کھا بیٹھے

چھوٹی سی بھول جوانی کی
جو تم کو یاد نہ آئے گی
اس بھول کے طعنے دے دے کر
دنیا ہم کو تڑپائے گی
اُٹھتے ہی نظر جھک جائے گی
آج ایسی ٹھوکر کھا بیٹھے

چاہت کے لیے جو رسموں کو
ٹھکرا کے گزرنے والے تھے
جو ساتھ ہی جینے والے تھے
جو ساتھ ہی مرنے والے تھے
طوفاں کے حوالے کر کے ہمیں
خود دُور کنارے جا بیٹھے

لو آج مری مجبُور وفا
بدنام کہانی بننے لگی
جو پریم نشانی پائی تھی
وہ پاپ نشانی بننے لگی
دکھ دے کے مجھے جیون بھر کا
وہ سُکھ کی سیج سجا بیٹھے

○

جیون کے سفر میں راہی
ملتے ہیں بچھڑ جانے کو
اور دے جاتے ہیں یادیں
تنہائی میں تڑپانے کو

یہ روپ کی دولت والے
کب سنتے ہیں دل کے نالے
تقدیر نے بے چین کر ڈالا
ان کے کسی دیوانے کو

جو ان کی نظر سے کھیلے
دکھ پائے مصیبت جھیلے
پھرتے ہیں یہ سب البیلے
دل لے کے مکر جانے کو

دل لے کے دغا دیتے ہیں
اک روگ لگا دیتے ہیں
ہنس ہنس کے جاں دیتے ہیں
یہ حسن کے پروانے کو

○

مایوس تو ہوں وعدے سے ترے
کچھ آس نہیں، کچھ آس بھی ہے
میں اپنے خیالوں کے صدقے
تو پاس نہیں اور پاس بھی ہے

ہم نے تو خوشی مانگی تھی مگر!
جو تو نے دیا اچھا ہی دیا!
جس غم کا تعلق ہو تجھ سے
وہ راس نہیں اور راس بھی ہے

پلکوں پہ لرزتے اشکوں میں
تصویر جھلکتی ہے تیری!
دیدار کی پیاسی آنکھوں میں
اب پیاس نہیں اور پیاس بھی ہے

○

اب وہ کرم کریں کہ ستم، میں نشے میں ہُوں
مجھ کو نہ کوئی ہوش نہ غم، میں نشے میں ہُوں

سینے سے بوجھ اُن کے غموں کا اُتار کے
آیا ہوں آج اپنی جوانی کو ہار کے
کہتے ہیں ڈگمگاتے قدم، میں نشے میں ہُوں

وہ بے وفا ہے، اب بھی یہ دل مانتا نہیں
کمبخت ناسمجھ ہے، انھیں جانتا نہیں
میں آج توڑ دُوں گا بھَرم، میں نشے میں ہُوں

فرصت نہیں ہے رونے رلانے کے واسطے
آئے نہ اُن کی یاد ستانے کے واسطے
اس وقت دل میں درد ہے کم، میں نشے میں ہُوں

○

میری مانگ کے رنگ میں تو نے راکھ چتا کی بھر دی
یہ کیسا انصاف ہے تیرا او بھگون بیدردی ؟

گھونگٹ اُٹھنے سے پہلے ودھوا کر دی پریت سہاگن
چھین لیا ماتھے کا ٹیکا، کھول لیے ہاتھوں کے کنگن
پلک جھپکتے ہنستی بستی، دنیا سُونی کر دی !

روپ سجا پر جوت نہ جاگی، سیج بچھی پر پھول نہ مہکے
بن گیا میرے مُنہ کا کالک دو نینوں کا کاجل بہہ کے
بھاگ بنانے والے تُو نے بھاگ پہ تہمت دھر دی!

○

لوگ عورت کو فقط جسم سمجھ لیتے ہیں
رُوح بھی ہوتی ہے اس میں یہ کہاں سوچتے ہیں

رُوح کیا ہوتی ہے اس سے انہیں مطلب ہی نہیں
وہ تو بس تن کے تقاضوں کا کہا مانتے ہیں
رُوح مرجائے تو یہ جسم ہے چلتی ہوئی لاش !
اس حقیقت کو نہ سمجھتے ہیں نہ پہچانتے ہیں

کتنی صدیوں سے یہ وحشت کا چلن جاری ہے
کتنی صدیوں سے ہے قائم یہ گناہوں کا رواج
لوگ عورت کی ہر اک چیخ کو نغمہ سمجھے
وہ قبیلوں کا زمانہ ہو کہ شہروں کا رواج

جبر سے نسل بڑھے، ظُلم سے تن میل کریں
یہ عمل ہم میں ہے بے علم پرندوں میں نہیں
ہم جو انسانوں کی تہذیب لیے پھرتے ہیں
ہم سا وحشی کوئی جنگل کے درندوں میں نہیں

اِک بُجھی رُوح لُٹے جسم کے ڈھانچے میں لیے
سوچتی ہوں مَیں کہاں جا کے مقدّر پھوڑ دوں
میں نہ زندہ ہوں کہ مرنے کا سہارا ڈھونڈوں
اور نہ مُردہ ہُوں کہ جینے کے غموں سے چھوٹوں

کون بتلائے گا مجھ کو کسے جا کر پوچھوں !
زندگی قہر کے سانچوں میں ڈھلے گی کب تک
کب تلک آنکھ نہ کھولے گا زمانے کا ضمیر !
ظُلم اور جبر کی یہ ریت چلے گی کب تک

O

بول نہ بول اے جانے والے، سن تو لے دیوانوں کی
اب نہیں دیکھی جاتی ہم سے یہ حالت ارمانوں کی
حُسن کے کھِلتے پھول ہمیشہ بے دردوں کے ہاتھ بکے
اور چاہت کے متوالوں کو دھول مِلی ویرانوں کی
دل کے نازک جذبوں پر بھی راج ہے سونے چاندی کا
یہ دنیا کیا قیمت دے گی سادہ دل انسانوں کی

○

یہ محلوں یہ تختوں یہ تاجوں کی دنیا
یہ انساں کے دشمن سماجوں کی دنیا
یہ دولت کے بھوکے رواجوں کی دنیا
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے؟

ہر اک جسم گھایل ہر اک روح پیاسی
نگاہوں میں اُلجھن دِلوں میں اداسی
یہ دنیا ہے یا عالمِ بدحواسی
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے؟

یہاں اِک کھلونا ہے انساں کی ہستی
یہ بستی ہے مُردہ پرستوں کی بستی
یہاں پر تو جیون سے ہے موت سستی
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے؟

جوانی بھٹکتی ہے بدکار بن کر
جواں جسم سجتے ہیں بازار بن کر
یہاں پیار ہوتا ہے بیوپار بن کر
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے

یہ دنیا، جہاں آدمی کچھ نہیں ہے
وفا کچھ نہیں، دوستی کچھ نہیں ہے
جہاں پیار کی قدر ہی کچھ نہیں ہے
یہ دنیا اگر مِل بھی جائے تو کیا ہے

جَلا دو اسے پھونک ڈالو یہ دنیا
مرے سامنے سے ہٹا لو یہ دُنیا
تمھاری ہے تم ہی سنبھالو یہ دنیا
یہ دنیا اگر مل بھی جائے تو کیا ہے؟

○

دیواروں کا جنگل جس کا آبادی ہے نام
باہر سے چُپ چپ لگتا ہے اندر ہے کہرام
دیواروں کے اس جنگل میں بھٹک رہے انسان
اپنے اپنے اُلجھے دامن جھٹک رہے انسان

اپنی بپتی چھوڑ کے آئے کون کسی کے کام
باہر سے چُپ چپ لگتا ہے اندر ہے کہرام
سینے خالی، آنکھیں سُونی، چہرے پہ حیرانی
جتنے گھنے ہنگامے اس میں اتنی گھنی ویرانی

راتیں قاتل، صُبحیں مجرم، مُلزم ہے ہر شام
باہر سے چُپ چپ لگتا ہے اندر ہے کہرام
حال نہ پوچھیں، درد نہ بانٹیں اس جنگل کے لوگ
اپنا اپنا سکھ ہے سب کا اپنا اپنا سوگ

کوئی نہیں جو ہاتھ بڑھا کر گرتوں کو لے تھام
باہر سے چُپ چُپ لگتا ہے اندر ہے کہرام
بے بس کو دوشی ٹھہرائے اس جنگل کا نیائے
سچ کی لاش پہ کوئی نہ روئے جھوٹ کو سیس نوائے

پتھر کی ان دیواروں میں پتھر ہو گئے رام
باہر سے چُپ چُپ لگتا ہے اندر ہے کہرام

○

موت کتنی بھی سنگدل ہو مگر زندگی سے تو مہرباں ہو گی

نت نئے رنج دل کو دیتی ہے، زندگی یہ خوشی کی دشمن ہے
موت سب سے نباہ کرتی ہے، زندگی زندگی کی دشمن ہے
کچھ نہ کچھ تو سکون پائے گا موت کے بس میں جس کی جاں ہو گی

رنگ اور نسل، نام اور دولت، زندگی کتنے فرق مانتی ہے
موت حد بندیوں سے اونچی ہے، ساری دنیا کو ایک جانتی ہے
جن اصولوں پہ مر رہے ہیں ہم، ان اصولوں کی قدرداں ہو گی

موت سے اور کچھ ملے نہ ملے زندگی سے تو جان چھوٹے گی
مسکراہٹ نصیب ہو کہ نہ ہو، آنسوؤں کی لڑی تو ٹوٹے گی
ہم نہ ہوں گے تو غم کسے ہو گا، ختم ہر غم کی داستاں ہو گی

○

سنسار کی ہر شے کا اتنا ہی فسانہ ہے
اِک دُھند سے آنا ہے اک دُھند میں جانا ہے

یہ راہ کہاں سے ہے یہ راہ کہاں تک ہے
یہ راز کوئی راہی سمجھا ہے نہ جانا ہے

اک پَل کی پلک پر ہے ٹھہری ہوئی یہ دُنیا
اک پلک جھپکنے تک ہر کھیل سہانا ہے

کیا جانے کوئی کس پر کس موڑ پر کیا بیتے
اس راہ میں اے راہی ہر موڑ بہانا ہے

ہم لوگ کھلونا ہیں اک ایسے کھلاڑی کا
جس کو ابھی صدیوں تک یہ کھیل رچانا ہے

○

میں زندگی کا ساتھ نبھاتا چلا گیا
ہر فکر کو دھوئیں میں اڑاتا چلا گیا

بربادیوں کا سوگ منانا فضول تھا
بربادیوں کا جشن مناتا چلا گیا

جو مل گیا اُسی کو مقدر سمجھ لیا
جو کھو گیا میں اس کو بھلاتا چلا گیا

غم اور خوشی میں فرق نہ محسوس ہو جہاں
میں دل کو اس مقام پہ لاتا چلا گیا

○

زندگی ظلم سہی، جبر سہی، غم ہی سہی
دل کی فریاد سہی، روح کا ماتم ہی سہی

ہم نے ہر حال میں جینے کی قسم کھائی ہے
اب یہی حال مقدر ہو تو شکوہ کیوں ہو
ہم سلیقے سے نبھا دیں گے جو دن باقی ہیں
چاہ رسوا نہ ہوئی، آہ بھی رسوا کیوں ہو

ہم کو تقدیر سے بے وجہ شکایت کیوں ہو
اسی تقدیر نے چاہت کی خوشی بھی دی تھی
آج اگر کانپتی پلکوں کو دیے ہیں آنسو
کل تھرکتے ہوئے ہونٹوں کو ہنسی بھی دی تھی

ہم ہیں مایوس مگر اتنے بھی مایوس نہیں
اک نہ اک دن تو یہ اشکوں کی لڑی ٹوٹے گی
اک نہ اک دن تو چھٹیں گے یہ غموں کے بادل
اک نہ اک دن تو اجالے کی کرن پھوٹے گی

○

بستی بستی، پربت پربت گاتا جائے بنجارا
لے کر دل کا اک تارا

پل دو پل کا ساتھ ہمارا، پل دو پل کی یاری
آج رُکے تو کل کرنی ہے چلنے کی تیاری

قدم قدم پر ہونی بیٹھی اپنا جال بچھائے
اس جیون کی راہ میں جانے کون کہاں رہ جائے

دھن دولت کے پیچھے کیوں ہے یہ دنیا دیوانی
یہاں کی دولت یہیں رہے گی ساتھ نہیں یہ جانی

سونے چاندی میں تُلتا ہو جہاں دلوں کا پیار
آنسو بھی بیکار وہاں پر آہیں بھی بیکار !

دنیا کے بازار میں آخر چاہت بھی بیوپار بنی
میرے دل سے اُن کے دل تک چاندی کی دیوار بنی

ہم جیسوں کے بھاگ میں لکھا چاہت کا وردان نہیں
جس نے ہم کو جنم دیا وہ پتھر ہے بھگوان نہیں

بستی بستی، پربت پربت گاتا جائے بنجارا

○

اپنی دنیا پہ صدیوں سے چھائی ہوئی ظلم اور لوٹ کی سنگدل رات ہے
یہ نہ سمجھو کہ یہ آج کی بات ہے

جب سے دھرتی بنی، جب سے دنیا بسی ہم یوں ہی زندگی کو ترستے رہے
موت کی آندھیاں گھِر کے چھاتی رہیں، آگ اور خوں کے بادل برستے رہے
تم بھی مجبور ہو، ہم بھی مجبور ہیں
کیا کریں یہ بزرگوں کی سوغات ہے

ہم اندھیری گپھاؤں سے نکلے مگر، روشنی اپنے سینوں سے پھوٹی نہیں
ہم نے جنگل تو شہروں میں بدلے مگر ہم سے جنگل کی تہذیب چھوٹی نہیں
اپنی بدنام انسانیت کی قسم
اپنی حیوانیت آج تک ساتھ ہے

ہم نے سقراط کو زہر کی بھینٹ دی، اور عیسیٰ کو سولی کا تحفہ دیا
ہم نے گاندھی کے سینے کو چھلنی کیا، کینیڈی سا جواں خوں میں نہلا دیا
ہر مصیبت جو انسان پر آئی ہے

ہیروشیما کی جھلسی زمیں کی قسم، ناگا ساکی کی سلگی فضا کی قسم
جن پہ جنگل کا قانون بھی تھوک دے، ایٹمی دور کے وہ درندے ہیں ہم
اپنی بڑھتی ہوئی نسل خود پھونک دے

ہم تباہی کے رستے پہ اتنا بڑھے، اب تباہی کا رستہ ہی باقی نہیں
خونِ انساں جہاں ساغروں میں بٹے اس سے آگے وہ محفل وہ ساقی نہیں
اس اندھیرے کی اتنی ہی اوقات تھی
اس سے آگے اُجالوں کی بارات ہے

○

یہ دنیا دو رنگی ہے

ایک طرف سے ریشم اوڑھے، ایک طرف سے ننگی ہے
ایک طرف اندھی دولت کی پاگل عیش پرستی
ایک طرف جسموں کی قیمت روٹی سے بھی سستی
ایک طرف ہے سونا گاچی، ایک طرف چورنگی ہے
یہ دنیا دو رنگی ہے

آدھے مُنہ پر نور برستا، آدھے مُنہ پر چیرے
آدھے تن پر کوڑھ کے دھبے آدھے تن پر ہیرے
آدھے گھر میں خوشحالی ہے آدھے گھر میں تنگی ہے
یہ دُنیا دو رنگی ہے

ماتھے اوپر مُکٹ سجائے، سر پر ڈھوئے گندا
دائیں ہاتھ سے بھکشا مانگے، بائیں سے دے چندا
ایک طرف بھنڈار چلائے، ایک طرف بھک منگی ہے
یہ دُنیا دو رنگی ہے

اِک سنگم پر لانی ہوگی، دُکھ اور سُکھ کی دھارا
نئے سرے سے کرنا ہوگا دولت کا بٹوارا
جب تک اونچ اور نیچ ہے باقی، ہر صورت بے ڈھنگی ہے
یہ دنیا دو رنگی ہے

○

کیا ملیے ایسے لوگوں سے جن کی فطرت چھپی رہے
نقلی چہرہ سامنے آئے، اصلی صورت چھُپی رہے

خود سے بھی جو خود کو چھپائیں، کیا اُن سے پہچان کریں
کیا اُن کے دامن سے لپٹیں، کیا اُن کا ارمان کریں
جن کی آدھی نیّت اُبھرے، آدھی نیّت چھپی رہے
نقلی چہرہ سامنے آئے، اصلی صورت چھُپی رہے

جن کے ظلم سے دکھی ہے جنتا، ہر بستی ہر گاؤں میں
دَیا دھرم کی بات کریں وہ بیٹھ کے سجی سبھاؤں میں
دان کا چرچا گھر گھر پہنچے، لوٹ کی دولت چھپی رہے
نقلی چہرہ سامنے آئے، اصلی صورت چھُپی رہے

دیکھیں ان نقلی چہروں کی کب تک جے جے کار چلے
اُجلے کپڑوں کی تہہ میں کب تک کالا سنسار چلے
کب تک لوگوں کی نظروں سے چھُپی حقیقت چھُپی رہے
نقلی چہرہ سامنے آئے، اصلی صورت چھُپی رہے

○

مہرباں کیسے کیسے، قدر داں کیسے کیسے
آج محفل میں آئے ہوئے ہیں

زہد بھی ان میں ہیں پارسا بھی
کشتیِ قوم کے ناخدا بھی
معتبر کیسے کیسے، راہ بر کیسے کیسے
آج مسند سجائے ہوئے ہیں

قوم کی خدمت کام ہے ان کا
اس خدمت سے نام ہے ان کا
بھوکوں کے غم میں گھلتے ہیں
سونے چاندی میں تلتے ہیں
دوران کی بلائیں، ان پہ قربان جائیں
یہ جو نظریں جھکائے ہوئے ہیں

سازاور ساز کے نغمے کیا ہیں
حُسن اور حُسن کے جلوے کیا ہیں
شرم ہے کیا اور غیرت کیا ہے؟
عزت کیا ہے عصمت کیا ہے؟
یہ ہوس کے پرندے ، نیک صورت درندے
دام سب پر لگائے ہوئے ہیں

یہ یتیموں کا حق کھانے والے
بے بسوں پہ ستم ڈھانے والے
بس چلے تو وطن بیچ ڈالیں
یہ مندروں کے صنم تک نہ چھوڑیں
یہ جو بدکاریوں سے ، چور بازاریوں سے
شان و شوکت بڑھائے ہوئے ہیں

○

دھرتی کی سلگتی چھاتی سے بے چین شرارے پوچھتے ہیں
تم لوگ جنھیں اپنا نہ سکے وہ خون کے دھارے پوچھتے ہیں
سڑکوں کی زباں چلّاتی ہے، ساگر کے کنارے پوچھتے ہیں
یہ کس کا لہو ہے کون مرا؟ اے رہبرِ ملک و قوم بتا!

یہ جلتے ہوئے گھر کس کے ہیں، یہ کٹتے ہوئے تن کس کے ہیں؟
تقسیم کے اندھے طوفاں میں لٹتے ہوئے گلشن کس کے ہیں؟
بدبخت فضائیں کس کی ہیں برباد نشیمن کس کے ہیں؟
کچھ ہم بھی سنیں، ہم کو بھی سنا!

کس کام کے ہیں یہ دین دھرم جو شرم کا دامن چاک کریں؟
کس طرح کے ہیں یہ دیش بھگت جو بستے گھروں کو خاک کریں؟
یہ روحیں کیسی روحیں ہیں جو دھرتی کو ناپاک کریں؟
آنکھیں تو اٹھا، نظریں تو ملا!

جس رام کے نام پہ خون بہے اس رام کی عزت کیا ہوگی ؟
جس دین کے ہاتھوں لاج لُٹے اس دین کی قیمت کیا ہوگی؟
انسان کی اس ذلت سے پرے شیطان کی ذلت کیا ہو گی؟
یہ وید ہٹا، قرآن اُٹھا!

یہ کس کا لہو ہے. کون مرا؟
اے رہبرِ ملک و قوم بتا!

میں نے پی شراب، تم نے کیا پیا؟ آدمی کا خوں
میں ذلیل ہُوں
تم کو کیا کہوں
تم پیو تو ٹھیک          ہم پئیں تو پاپ
تم جیو تو پُن          ہم جئیں تو پاپ
تم شریف لوگ          تم امیر لوگ
ہم تباہ حال          ہم فقیر لوگ
زندگی بھی روگ          موت بھی عذاب
میں نے پی شراب

تم کہو تو سچ　　ہم کہیں تو جھوٹ
تم کو سب معاف　　ظلم ہو کہ لوٹ
تم نے کتنے دل　　چاک کر دیے
کتنے بستے گھر　　خاک کر دیے
میں نے تو کیا خود کو ہی خراب کیا
میں نے پی شراب
ریت اور رواج　　سب تمہارے ساتھ
دھرم اور سماج　　سب تمہارے ساتھ
اپنے ساتھ کیا ؟　　دھول اور دھواں
آج چاہے تم　　نوچ لو زباں
آنے والا دور لے گا سب حساب
میں نے پی شراب
تم نے کیا پیا آدمی کا خوں
میں ذلیل ہوں ، تم کو کیا کہوں؟

○

انصاف کا ترازو جو ہاتھ میں اٹھائے
جُرموں کو ٹھیک تولے!
ایسا نہ ہو کہ کل کا اتہاس کار بولے
مجرم سے بھی زیادہ
منصف نے ظُلم ڈھایا
کیں پیش اُس کے آگے غم کی گواہیاں بھی
رکھیں نظر کے آگے دل کی تباہیاں بھی
اس کو یقیں نہ آیا
انصاف کر نہ پایا
اور اپنے اس عمل سے
بدکار مجرموں کے ناپاک حوصلوں کو
کچھ اور بھی بڑھایا

انصاف کا ترازو جو ہاتھ میں اٹھائے
یہ بات یاد رکھے
سب منصفوں سے اوپر

○

اِک اور بھی ہے منصف
وہ دو جہاں کا مالک
سب حال جانتا ہے
نیکی کے اور بدی کے
احوال جانتا ہے
دنیا کے فیصلوں سے
مایوس جانے والا
ایسا نہ ہو کہ اس کے دربار میں پکارے
ایسا نہ ہو کہ اُس کے انصاف کا ترازو
اک بار پھر سے تولے
مجرم کے ظلم کو بھی
منصف کی بھول کو بھی
اور اپنا فیصلہ دے
وہ فیصلہ کہ جس سے
یہ رُوح کانپ اُٹھے!

○

خدائے برتر! تری زمیں پر، زمیں کی خاطر یہ جنگ کیوں ہے؟
ہر ایک فتح و ظفر کے دامن پہ خونِ انساں کا رنگ کیوں ہے؟

زمیں بھی تیری ہے، ہم بھی تیرے، یہ ملکیت کا سوال کیا ہے؟
یہ قتل و خوں کا رواج کیوں ہے، یہ رسمِ جنگ و جدال کیا ہے؟
جنہیں طلب ہے جہان بھر کی، انہیں کا دل اتنا تنگ کیوں ہے؟
خدائے برتر! تری زمیں پر، زمیں کی خاطر یہ جنگ کیوں ہے؟

غریب ماؤں، شریف بہنوں کو امن و عزت کی زندگی دے
جنہیں عطا کی ہے تُو نے طاقت، انہیں ہدایت کی روشنی دے
سروں میں کبر و غرور کیوں ہے، دلوں کے شیشے پہ زنگ کیوں ہے؟
خدائے برتر! تری زمیں پر، زمیں کی خاطر یہ جنگ کیوں ہے؟

○

برسو رام دھڑاکے سے
بڑھیا مرگئی فاقے سے

کل جُگ میں بھی مرتی ہے، ست جُگ میں بھی مرتی تھی
یہ بڑھیا اس دنیا میں سدا ہی فاقے کرتی تھی
جینا اس کو راس نہ تھا
پیسا اس کے پاس نہ تھا
اس کے گھر کو دیکھ کے لچھمی مُڑ جاتی تھی ناکے سے
برسو رام دھڑاکے سے

جھوٹے ٹکڑے کھا کے بڑھیا، تپتا پانی پیتی تھی !
مرتی ہے تو مر جانے دو، پہلے بھی کب جیتی تھی ؟
جے ہو پیسے والوں کی
گیہوں کے دلالوں کی
ان کا حد سے بڑھا منافع کچھ ہی کم ہے ڈاکے سے
برسو رام دھڑاکے سے

○

عورت نے جنم دیا مَردوں کو، مَردوں نے اُسے بازار دیا
جب جی چاہا مَسلا کچلا، جب جی چاہا دھتکار دیا

تُلتی ہے کہیں دیناروں میں، بِکتی ہے کہیں بازاروں میں
ننگی نچوائی جاتی ہے عیاشوں کے درباروں میں
یہ وہ بے عزت چیز ہے جو بٹ جاتی ہے عزت داروں میں
عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اُسے بازار دیا

مَردوں کے لیے ہر ظُلم روا، عورت کے لیے رونا بھی خطا
مَردوں کے لیے ہر عیش کا حق، عورت کے لیے جینا بھی سزا
مردوں کے لیے لاکھوں سیجیں، عورت کے لیے بس ایک چِتا
عورت نے جنم دیا مَردوں کو، مَردوں نے اُسے بازار دیا

جن سینوں نے ان کو دودھ دیا ان سینوں کا بیوپار کیا
جس کوکھ میں ان کا جسم ڈھلا اس کوکھ کا کاروبار کیا
جس تن سے اُگے کونپل بن کر اس تن کو ذلیل و خوار کیا

سنسار کی ہر اک بے شرمی غربت کی گود میں پلتی ہے
چکلوں ہی میں آ کر رُکتی ہے، فاقوں سے جو راہ نکلتی ہے
مردوں کی ہوس ہے جو اکثر عورت کے پاپ میں ڈھلتی ہے
عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اُسے بازار دیا

عورت سنسار کی قسمت ہے پھر بھی تقدیر کی ہیٹی ہے
اوتار پیمبر جنتی ہے پھر بھی شیطان کی بیٹی ہے
یہ وہ بدقسمت ماں ہے جو بیٹوں کی سیج پہ لیٹی ہے
عورت نے جنم دیا مردوں کو، مردوں نے اُسے بازار دیا

○

یہ کوچے یہ نیلام گھر دل کشی کے
یہ لٹتے ہوئے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں، کہاں ہیں محافظ خودی کے
جنہیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہیں
کہاں ہیں، کہاں ہیں، کہاں ہیں

یہ پُر پیچ گلیاں، یہ بدنام بازار
یہ گمنام راہی، یہ سکّوں کی جھنکار
یہ عصمت کے سودے یہ سودوں پہ تکرار
جنہیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہیں
کہاں ہیں، کہاں ہیں، کہاں ہیں

یہ صدیوں سے بے خواب سہمی سی گلیاں
یہ مسلی ہوئی ادھ کھلی زرد کلیاں
یہ بکتی ہوئی کھوکھلی رنگ رلیاں
جنہیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہیں
کہاں ہیں، کہاں، کہاں ہیں؟

یہ اُجلے دریچوں میں پایل کی چھن چھن
تھکی ہاری سانسوں پہ طبلے کی دھن دھن
یہ بے روح کمروں میں کھانسی کی ٹھن ٹھن
جنہیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہیں
کہاں ہیں، کہاں ہیں، کہاں ہیں؟

یہ پھولوں کے گجرے یہ پیکوں کے چھینٹے
یہ بیباک نظریں، یہ گستاخ فقرے
یہ ڈھلکے بدن اور یہ بیمار چہرے
جنہیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہیں
کہاں ہیں، کہاں ہیں، کہاں ہیں

یہاں پیر بھی آ چکے ہیں، جواں بھی
تنومند بیٹے بھی، ابّا میاں بھی
یہ بیوی بھی ہے اور بہن بھی ہے ماں بھی
جنہیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہے
کہاں ہیں، کہاں ہیں، کہاں ہیں؟

مدد چاہتی ہے یہ حوّا کی بیٹی
یشودھا کی ہم جنس، رادھا کی بیٹی
پیمبر کی اُمّت، زلیخا کی بیٹی
جنہیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہیں
کہاں ہیں، کہاں ہیں، کہاں ہیں؟

ذرا ملک کے رہبروں کو بلاؤ
یہ کوچے، یہ گلیاں، یہ منظر دکھاؤ
جنہیں ناز ہے ہند پر اُن کو لاؤ
جنہیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہیں
کہاں ہیں، کہاں ہیں، کہاں ہیں؟

○

لاگا چُنری میں داگ چھپاؤں کیسے
______ گھر جاؤں کیسے
ہو گئی مَیلی موری چُنریا
کورے بدن سی کوری چُنریا
جا کے بابل سے نجریں ملاؤں کیسے
______ گھر جاؤں کیسے
بھول گئی سب بچن بدا کے
کھو گئی میں سُسرال میں آ کے
جا کے بابل سے نجریں ملاؤں کیسے
______ گھر جاؤں کیسے

کوری چنریا آتما موری میل ہے مایا جال
وہ دنیا موے بابل کا گھر، یہ دنیا سسرال

جا کے بابل سے نجریں ملاؤں کیسے
——— گھر جاؤں کیسے
لاگا چنری میں داگ چھپاؤں کیسے

○

کام، کرودھ اور لوبھ کا مارا جگت نہ آیا راس
جب جب رام نے جنم لیا، تب تب پایا بن باس

کلجگ تک چلتی آئی ہے، ست جگ کی یہ ریت
سب کچھ ہار چکے جب اپنا، تب ہے رام کی جیت
جگ بدلے پر بدل نہ پایا اب تک یہ اتہاس

چھوڑ کے اپنے محل دو محلے جنگل جنگل پھرنا
اوروں کے سکھ چین کی خاطر دکھ سنکٹ میں گھرنا
ہے یہی رام کے لیکھ کی ریکھا، آ گیا اب وشواس

رام ہر اک جگ میں آئے پر کون انھیں پہچانا
رام کی پوجا کی جگ نے پر رام کا ارتھ نہ جانا
تکتے تکتے بوڑھے ہو گئے دھرتی اور آکاس

○

کعبے میں رہو یا کاشی میں، نسبت تو اسی کی ذات سے ہے
تم رام کہو کہ رحیم کہو، مطلب تو اسی کی بات سے ہے

یہ مسجد ہے، وہ بت خانہ، چاہے یہ مانو، چاہے وہ مانو
مقصد تو ہے دل کو سمجھانا، چاہے یہ مانو، چاہے وہ مانو

یہ شیخ و برہمن کے جھگڑے، سب ناسمجھی کی باتیں ہیں
ہم نے تو ہے بس اتنا جانا چاہے یہ مانو، چاہے وہ مانو

گر جذبِ محبت صادق ہو، ہر در سے مرادیں ملتی ہیں
ہر گھر ہے اسی کا کاشانہ، چاہے یہ مانو چاہے وہ مانو

○

ایشور، اللہ تیرے نام
سب کو سنمتی دے بھگوان!

اس دھرتی پر بسنے والے
سب ہیں تیری گود کے پالے
کوئی نیچ نہ کوئی مہان
سب کو سنمتی دے بھگوان

جنم کا کوئی مول نہیں ہے
جنم منش کا تول نہیں ہے
کرم سے ہے سب کی پہچان
سب کو سنمتی دے بھگوان

○

سنسار سے بھاگے پھرتے ہو، بھگوان کو تم کیا پاؤ گے
اس لوک کو بھی اپنا نہ سکے، اس لوک میں بھی پچھتاؤ گے

یہ پاپ ہے کیا، یہ پن ہے کیا، ریتوں پر دھرم کی مہریں ہیں
ہر یگ میں بدلتے دھرموں کو کیسے آدرش بناؤ گے

یہ بھوک بھی ایک تپسیا ہے، تم تیاگ کے مارے کیا جانو
اپمان رچیتا کا ہوگا، رچنا کو اگر ٹھکراؤ گے

ہم کہتے ہیں یہ جگ اپنا ہے، تم کہتے ہو جھوٹا سپنا ہے
ہم جنم بنا کر جائیں گے، تم جنم گنوا کر جاؤ گے

○

آنا ہے تو آ راہ میں کچھ پھیر نہیں ہے
بھگوان کے گھر دیر ہے، اندھیر نہیں ہے

جب تجھ سے نہ سلجھیں ترے اُلجھے ہوئے دھندے
بھگوان کے انصاف پہ سب چھوڑ دے بندے
خود ہی تری مشکل کو وہ آسان کرے گا
جو تو نہیں کر پایا، وہ بھگوان کرے گا

کہنے کی ضرورت نہیں آنا ہی بہت ہے
اس در پہ ترا سیس جھکانا ہی بہت ہے
جو کچھ ہے ترے دل میں سبھی اس کو خبر ہے
بندے ترے ہر حال پہ مالک کی نظر ہے

بن مانگے ہی ملتی ہیں یہاں من کی مرادیں
دل صاف ہو جن کا وہ یہاں آ کے صدا دیں
ملتا ہے جہاں نیائے، وہ دربار یہی ہے
سنسار کی سب سے بڑی سرکار یہی ہے

تیری ہے زمیں تیرا آسماں !
تو بڑا مہرباں، تو بخشش کر
سبھی کا ہے تو، سبھی تیرے
خدا میرے ، تو بخشش کر

تیری مرضی سے اے مالک !
ہم اس دنیا میں آئے ہیں
تری رحمت سے ہم سب نے
یہ جسم اور جان پائے ہیں
تو اپنی نظر ہم پر رکھنا
کس حال میں ہیں، یہ خبر رکھنا

تُو چاہے تو ہمیں رکھے!
تُو چاہے تو ہمیں مارے
ترے آگے جھکا کے سر
کھڑے ہیں آج ہم سارے
سب سے بڑی طاقت والے
تو چاہے تو ہر آفت ٹالے

تو بخشش کر!

○

تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا
انسان کی اولاد ہے، انسان بنے گا

اچھا ہے ابھی تک ترا کچھ نام نہیں ہے
تجھ کو کسی مذہب سے کوئی کام نہیں ہے
جس علم نے انسانوں کو تقسیم کیا ہے
اُس علم کا تجھ پر کوئی الزام نہیں ہے
تو بدلے ہوئے وقت کی پہچان بنے گا
انسان کی اولاد ہے، انسان بنے گا

مالک نے ہر انسان کو انسان بنایا
ہم نے اسے ہندو یا مسلمان بنایا
قدرت نے تو بخشی تھی ہمیں ایک ہی دھرتی
ہم نے کہیں بھارت، کہیں ایران بنایا

جو توڑ دے ہر بند وہ طوفان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا

نفرت جو سکھائے وہ دھرم تیرا نہیں ہے
انساں کو جو روندے وہ قدم تیرا نہیں ہے
قرآن نہ ہو جس میں وہ مندر نہیں تیرا
گیتا نہ ہو جس میں وہ حرم تیرا نہیں ہے

تو امن کا اور صلح کا ارمان بنے گا
انسان کی اولاد ہے، انسان بنے گا

# متفرق اشعار

اپنی تباہیوں کا مجھے کوئی غم نہیں
تم نے کسی کے ساتھ محبّت نبھا تو دی

---

وجہ بے رنگیٔ گلزار کہوں یا نہ کہوں
کون ہے کتنا گنہگار کہوں یا نہ کہوں

---

آہ! اس کشمکشِ صبح و مَسا کا انجام
میں بھی ناکام مِری سعیٔ عمل بھی ناکام

---

کون جانے یہ تِرا شاعرِ آشفتہ مزاج
کتنے مغرور خداؤں کا رقیب آج بھی ہے!

یہ جشنِ جشنِ مسرت نہیں تماشا ہے
نئے لباس میں نکلا ہے رہزنی کا جلوس

یہ غم بہت ہیں مری زندگی مٹانے کو
اُداس رہ کے مرے دِل کو اور رنج نہ دو!

حیات اِک مستقل غم کے سوا کچھ بھی نہیں شاید
خوشی بھی یاد آتی ہے تو آنسو بن کے آتی ہے

تم میرے لیے اب کوئی الزام نہ ڈھونڈو
چاہا تھا تمھیں، اِک یہی الزام بہت ہے

مُفلسی حسِ لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی

جس میں خلوصِ فکر نہ ہو وہ سخن فضول
جس میں نہ دل شریک ہو اُس کے میں کچھ نہیں